آفتابِ نبوّت کی سُنہری شعاعیں

سیرتِ سرورِ عالم کے درخشاں پہلو

اللہ
رسول
محمد

عبدالمالک مجاہد

آفتابِ نبوّت کی سُنہری شعاعیں

سیرتِ سرورِ عالم کے درخشاں پہلو

عبدالمالک مجاہد

دارالسّلام

کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

ریاض • جدہ • شارجہ • لاھور • کراچی

اسلام آباد • لندن • ھیوسٹن • نیو یارک

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

فہرست مضامین

مضامین

مضامین

عرض مؤلف

2006 کی بات ہے کہ ڈنمارک کے ایک چھوٹے سے اخبار نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کی اور ناپاک خاکے شائع کیے۔ ان خاکوں کے خلاف دنیا بھر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ کتنے ہی ملکوں میں شدید ہنگامے ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں۔ جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ مسلمانوں نے نے نہایت غم و غصے کا اظہار کیا۔ دنیا بھر کے مہذب لوگوں نے اس گھٹیا حرکت پر نفرت کا اظہار کیا۔ مگر بدقسمتی سے اس احتجاج کو سنجیدگی سے لینے کی بجائے یورپ کے بعض دیگر ممالک نے بھی ان خاکوں کی اشاعت کی مذموم حرکت کر ڈالی۔ عربی کا ایک مقولہ ہے (رُبَّ ضارَّةٍ نافِعَةٌ) کہ بعض اوقات غلط کاموں کے نتائج بھی عمدہ نکلتے ہیں۔ جہاں ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ ہوا وہیں اہل حل وعقد نے سوچنا

شروع کیا کہ ایسا ہوا کیوں ہے؟۔اس سوال پر دنیا بھر میں کتنے ہی سیمینار اور مذاکرات ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت اور ان کے حقوق کے حوالے سے مضامین اخبارات میں شائع ہوئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بلاشبہ مسلمانوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے حقوق ادا نہیں کیے۔ان کی سیرت کو لوگوں تک ان کی زبان میں نہیں پہنچایا گیا۔ارباب فکر و دانش نے اللہ کے رسول ﷺ کے کردار، ان کے افعال اور ان کے معاملات کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور پھر سیرت نبوی ﷺ کا دنیا بھر میں ایک نئے انداز سے چرچا شروع ہوا۔عربی زبان میں بطور خاص سیرت پاک پر درجنوں کتابیں تالیف کی گئیں نیز سیرت پاک کی کتابوں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ گزشتہ دو سالوں میں سیرت پاک پر جتنی کتابیں شائع ہوئیں، تقسیم کی گئیں یا ان کا مطالعہ کیا گیا ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

راقم الحروف بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہے جو محبت رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار ہے۔اور اس بات کا داعی ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کا حقیقی حسن دنیا والوں کو دکھا دیا جائے اور ان تک ان کی زبان میں آپ ﷺ کی سیرت پہنچا دی جائے تو ہرزہ سرائی کرنے والے آپ ﷺ کے ہمنوا بن جائیں۔پھر نجانے وہ کون سے مبارک لمحات تھے جب راقم نے جدہ سے شائع ہونے والے اردو نیوز کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا جس میں ان کو تجویز دی کہ آپ لوگ ہر روز سیرت پاک پر ایک کالم شائع کیا کریں تا کہ قارئین کو اللہ کے رسول ﷺ کے روز و شب کے

بارے میں جاننے کا موقع مل سکے۔ اس لیے کہ وہ کائنات کی واحد ہستی ہیں جن میں دنیا بھر کی خوبیاں اور صفات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ فقط وہی ایک ایسی ذات ہیں جن کے ساتھیوں نے ان کی ایک ایک ادا کو نہ صرف نوٹ کیا بلکہ اس کو محفوظ کر کے ہم تک پہنچایا۔ اور اللہ تعالی کی کروڑ ہا رحمتیں ہوں ان سیرت نگاروں پر جنہوں نے ان کے تمام اقوال اور افعال کو قلم بند کیا۔ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ تشنہ بیان نہیں چھوڑا۔ معمولی معمولی باتیں بھی ہم تک پہنچائیں۔ مثلاً ہمیں بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کھانا کیسے تناول فرماتے تھے؟ کتنی انگلیوں سے کھاتے تھے؟ ایک لقمے سے دوسرے لقمے کے درمیان کتنا فاصلہ رکھتے تھے؟ آپ ﷺ کائنات کی وہ واحد ہستی ہیں جن کے بارے میں سینکڑوں کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں تالیف کی گئی ہیں۔

اردو نیوز کے ایڈیٹر کو خط لکھے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اردو میگزین کے ایڈیٹر برادرم رؤوف طاہر کا فون آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سیرت کے حوالے سے آپ کی تجویز بڑی اچھی ہے مگر عملاً ہر روز سیرت پر کالم لکھنا اتنا آسان کام نہیں۔ البتہ اسے ہفتہ وار اردو میگزین میں شائع کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ یہ کالم آپ لکھیں۔ یہ بات کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ میں بھی سیرت سرورِ عالم ﷺ کے حوالے سے کچھ لکھ سکوں گا۔ نہ مجھے عالم ہونے کا دعوی ہے اور نہ ہی میں کوئی سکہ بند لکھاری ہوں۔ فون بند ہو گیا اور مجھے اس سوچ و بچار میں مبتلا کر گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں سیرت طیبہ کے اوراق لکھوں۔ پھر میں نے

سوچا اور غور وفکر کیا۔ ذہن میں آیا: عبدالمالک! گھر بیٹھے اتنی بڑی سعادت تمہیں مل رہی ہے۔ سیرت پاک پر لکھنا بلاشبہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔ قارئین کرام! اس روز میں خوشی سے خوب رویا۔ اپنی قسمت پر فرحاں وشاداں بھی تھا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں لکھوں گا۔ اللہ سے دعا کی: اے میرے اللہ! میرے قلم میں برکت عطا فرما۔ مجھے ہمت اور توفیق عطا فرما کہ میں نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں سیرت طیبہ کے اوراق لکھوں۔ شروع سے یہ طے کیا کہ سیرت طیبہ کے یہ اوراق علماء کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں کے لیے ہونگے۔ الفاظ نہایت آسان اور سادہ ہوں تاکہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی انہیں سمجھ سکے۔ ہماری نوجوان نسل جوان دنوں سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے وہ اردو پڑھنے میں دقت محسوس کرتی ہے، لہذا یہ کالم نہایت ہی آسان اور سادہ انداز میں کہانی کی طرح ہو۔ تاکہ یہ دلوں میں اتر جائے۔ تاہم اس بات کا التزام کیا جائے کہ کوئی واقعہ موضوع یا غیر مستند نہ ہو۔ میں نے اردو میگزین کے ذمہ داران کو پہلے ہی دن بتادیا تھا کہ دنیاوی لالچ قطعاً میرے پیش نظر نہیں ہے۔ آپ سے کسی جزا اور شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کالموں کو بارگاہ الٰہی میں قبولیت حاصل ہوجائے اور قیامت والے دن مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت نصیب ہوجائے تو یہ سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

شروع میں سیرت نبوی ﷺ کا ایک ورق شائع ہوتا تھا۔ خود مجھے بھی تشنگی محسوس ہوتی تھی۔ ادھر قارئین کرام نے اس سلسلہ کو بہت پسند کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دو صفحات کردیے جائیں۔ اور پھر ایک دن رؤوف طاہر بھائی فون پر کہہ رہے تھے کہ

اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے دو صفحات تک بڑھا دیں۔ لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر میں نے ہاں کر دی۔

قارئین کرام! اس کے بعد گزشتہ دو سوا دو سالوں میں میرا بہت سا وقت سیرت پاک کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ گھر پہنچنے کے بعد سیرت کی مختلف کتابیں ہوتیں اور میں ہوتا۔ پھر مختلف واقعات کو اپنے الفاظ میں ترتیب دے لیتا۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہ تھا جتنا میں شروع میں سمجھتا تھا۔ لیکن اللہ تعالی کی مدد آتی گئی اور اللہ تعالی نے اس کام میں میرے لیے آسانی پیدا فرما دی۔ قلم میں روانی آتی چلی گئی اور جب میں لکھنے بیٹھ جاتا تو پھر قلم تسلسل سے لکھتا چلا جاتا۔

گزشتہ سال رمضان المبارک 2007 میں میرے گھر میں ڈاکٹر فا-عبد الرحیم صاحب تشریف لائے۔ وہ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ طیبہ میں گزشتہ چودہ سال سے مدیر مرکز الترجمات ہیں۔ یہ بلاشبہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ مدتوں مدینہ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ نہایت قابل اور ذہین وفطین شخصیت اور عربی زبان کے ماہر ہیں۔ میں ان کی اپنے والد کی طرح عزت کرتا ہوں۔ میں نے ان سے سیرت نبوی ﷺ کے اوراق کا ذکر کیا تو انہوں نے نہایت محبت اور پیار سے کہا کہ بس ان اوراق میں سے صرف واقعات کو نکال کر شائع کر دیں۔ ہماری نوجوان نسل کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ ان کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آج رات ہی اس پر کام شروع کر دوں گا۔

اس دوران جو مضامین شائع ہو چکے تھے ہر چند کہ وہ کمپیوٹر میں محفوظ تھے مگر وہ کسی

ترتیب سے نہ تھے۔ عزیزم نجم المجید سے کہا کہ ان کو ترتیب دیں۔ جب ان کو جمع کیا گیا تو وہ چھ سو صفحات سے کچھ زیادہ تھے۔ اس کے بعد ایک نئے انداز سے کام شروع کیا گیا۔ واقعات کو نشان زد کر کے انہیں کتابی شکل دی گئی۔

جب کتاب تیار ہو گئی تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ سیرت پر کتاب ہے۔ اسے عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ لہذا اس کے کاپی رائٹ نہیں رکھے جائیں گے اور اس کی قیمت بھی نہایت مناسب ہو گی۔ اس کی پرنٹنگ دنیا کے سب سے اعلیٰ ورق پر ہونی چاہیے۔ فروری 2008 میں فرانس کی بلورائے کمپنی کا نمائندہ ریاض میں تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر میں نے جہاں اسے اسلام کا تعارف کروایا وہیں اس سے یہ بھی پوچھا کہ 70 یا 80 گرام کا پیپر سب سے اعلیٰ کوالٹی میں کہاں بنتا ہے۔ یہ معروف کمپنی دنیا بھر میں سب سے اعلیٰ کوالٹی کا باریک پیپر بناتی ہے۔ اسے عرف عام میں بائبل پیپر کہتے ہیں۔ اس کا وزن 25 گرام سے 50 گرام تک ہوتا ہے۔ میں نے اس کا نام بخاری پیپر رکھا ہوا ہے۔ الحمدللہ دارالسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے 25 گرام پیپر پر قرآن پاک پاکٹ سائز میں ہالینڈ سے شائع کیا تھا۔ بعد میں صحیح بخاری عربی زبان میں 33 گرام پر اٹلی سے شائع کی۔ اور پھر تمام کتب ستہ (المعروف صحاح ستہ) 40 گرام ورق پر ایک جلد میں شائع کیں جس میں 2772 صفحات ہیں۔ اس کا سائز A-4 ہے۔ یہ کتاب اسلامی دنیا کا ایک شاہکار ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ دنیا میں سب سے اعلیٰ پیپر کہاں تیار ہوتا ہے۔ اس نے فن لینڈ کا نام لیا۔ میری خواہش تھی کہ دنیا کے سب

سے مہنگے اور اعلیٰ کوالٹی کے پیپر پر یہ کتاب شائع ہو۔ مگر فوری طور پر اس کا بندوبست نہ ہوسکا۔ فرانسیسی نمائندہ نے حسب وعدہ اس کی تفصیلات تو بھجوادیں مگر اس سے کتاب خاصی مہنگی ہوجاتی۔

قارئین کرام! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کی کتابوں کو سونے کے پانی سے شائع کرواتا اور انہیں عام کرتا۔ میری خواہش ہوگی کہ اہل ثروت اس اہم کام میں اپنا کردار ادا کریں۔ میں شکر گزار ہوں دارالسلام کے نگران اعلیٰ شیخ عبداللہ المعتاز اور ان کے بیٹے محمد المعتاز کا کہ انہوں نے میری اس خواہش کو خوش دلی سے قبول کیا۔ اس کتاب کے کوئی کاپی رائٹ نہیں ہونگے۔ دنیا کے ہر شخص کو اسے شائع کرنے، فوٹو کاپی کرنے اور کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ کسی بھی میگزین، رسالے اور اخبار میں بغیر کسی پیشگی اجازت کے اسے شائع کیا جاسکتا ہے۔ اگر مؤلف کا نام لکھنا چاہیں تو اجازت ہے نہ بھی لکھیں تو کوئی حرج نہیں۔ بہرحال سیرت کی کتب کو عام کرنا اور اسے ہر گھر تک پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ راقم کا دعویٰ ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت احسن پیرائے میں اسلام دشمنوں تک انہی کی زبان میں پہنچادی جائے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ان کے نظریات وخیالات یقینی طور پر تبدیل ہوجائیں گے۔ کم از کم مجھے سیرت پاک کے اوراق لکھنے سے جو فوائد حاصل ہوئے ان میں ایک یہ ہے کہ الحمدللہ، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ فِدَاهُ أبي وأُمِّي ونَفْسِي وكُلُّ شَيْءٍ عِنْدِي۔

بلا شک وشبہ وہ رب کائنات کے بعد سب سے اعلیٰ اور ارفع ہستی ہیں۔ ہم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

فجر کی نماز کی ادائیگی اور روضہ رسول ﷺ پر درود وسلام پڑھنے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مسجد نبوی میں بیٹھ کر یہ الفاظ اس خواہش کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ روز قیامت میرا شمار خدام رسول ﷺ میں سے ہو۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کی شفاعت نصیب ہو۔ ان کے جھنڈے تلے ہم اکٹھے ہوں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے ہمیں حوض کوثر کا پانی نصیب ہو۔ (آمین ثم آمین، یا رب العالمین)

نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنی اہلیہ محترمہ حافظہ انیسہ فردوس کا ذکر نہ کروں جنہوں نے میری اس کتاب کو مکمل کرنے میں خاصی تشجیع کی۔ تسلسل سے میرا حوصلہ بڑھایا، ساری کتاب کو پڑھا اور مجھے مفید مشورے دیے۔ میں اردو نیوز کے مینیجنگ ایڈیٹر جناب طارق مشخص، اردو میگزین کے ایڈیٹر جناب رؤوف طاہر، اردو نیوز کے نیوز ایڈیٹر جناب ابصار سید اور آرٹ ایڈیٹر شہزاد احمد کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ نہایت محبت سے سیرت کے اوراق شائع کر رہے ہیں۔ اور اگر شکریہ کی بات آئی ہے تو دارالسلام لاہور برانچ کے حافظ عبدالعظیم اسد، محبّ احمد کامران، حافظ محمد ندیم، مولانا محمد مشتاق اور خرم شہزاد کا بھی شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے بھی یہ کتاب پڑھی اور مناسب مشورے دیے۔ اور اس میں زبان وبیان کی مناسب تبدیلیاں کیں۔ دارالسلام ریاض کی علمی کمیٹی کے انچارج برادرم قاری محمد اقبال عبدالعزیز کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تخریج اور مراجعہ

کی ذمہ داری نبھائی۔ عزیزم نجم المجید نے اس کتاب کی خوبصورت ڈیزائننگ کی۔
واضح رہے کہ یہ سیرت کے متفرق واقعات ہیں۔ یہ مکمل سیرت کی کتاب نہیں ہے۔ ان شاء اللہ مستقبل میں مزید واقعات کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔
بارگاہ الٰہی میں عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اس کاوش کو مؤلف، قارئین کرام اور جملہ معاونین کرام، سب کی نجات کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کے لیے اسے ذخیرہ آخرت بنائے۔ (آمین)

کتاب وسنت کا ایک ادنیٰ خادم:

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام الریاض، لاہور

مدینہ طیبہ، مسجد نبوی شریف

26 جمادی الآخرۃ بروز پیر

بمطابق 30 جون 2008

1

اللہ کے رسول ﷺ کا خاندان نہایت مبارک تھا۔ اس کی تاریخ آج سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے ایک شہر "اُور" کے باشندے تھے۔

یہ شہر فرات کے مغربی ساحل پر کونے کے قریب واقع تھا۔ اس کی کھدائی کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں، ان کے باعث اس شہر کے بارے میں بہت سی تفصیلات منظر عام پر آئی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی بعض تفاصیل اور باشندگان ملک کے دینی اور اجتماعی حالات سے بھی آگہی ہوئی ہے۔ اس زمانے میں سلطنت بابل عروج پر تھی۔ سلطنت کی مالی حالت مستحکم اور فوجی طاقت زبردست تھی۔ دولت کی کثرت نے بادشاہ کے دماغ میں اس قدر غرور بھر دیا تھا کہ اس نے سلطنت کے بڑے معبد خانے میں اپنی سونے کی مورت رکھوا دی اور حکم دیا

کہ سب لوگ میری مورت کو سجدہ کریں اور منت ونذر و نیاز بھی میرے ہی نام کی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی ہدایت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ ان کا سلسلۂ نسب 9 واسطوں سے حضرت نوح علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

بادشاہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید پسند نہ آئی۔ کیونکہ اسے قبول کرنے کی صورت میں بادشاہ کو خدائی کے درجے سے اتر کر بندہ بننا پڑتا تھا۔ حضرت ابراہیم کی مخالفت صرف بادشاہ ہی نے نہیں کی بلکہ خود ان کے گھر کے افراد نے بھی کی۔ جب آپ نے قوم بادشاہ اور اپنے خاندان کی مخالفت دیکھی تو اپنے وطن سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گزر اوقات کے لیے بھیڑ بکریاں پال رکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں برکت دی اور وہ بڑھ کر بہت بڑے بڑے ریوڑ بن گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام انتہائی مہمان نواز تھے۔ ان کی کنیت ابوضیفان (مہمانوں والا، مہمان نواز) تھی۔ ان کے والد کا نام آزر تھا۔ بعض علمائے نسب نے والد کا نام تارخ بھی بیان کیا ہے۔ جب اس کی عمر 75 سال کی ہوئی تو اس کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ ناحور اور ہاران بھی تارخ کے بیٹے تھے۔ ہاران کے بیٹے لوط علیہ السلام تھے۔ ہاران کی وفات اس کے باپ ہی کی زندگی میں اسی علاقے میں ہو گئی تھی جہاں وہ پیدا ہوئے۔ یہ کلدانیوں کا علاقہ، یعنی بابل کی سرزمین تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شکل وصورت کے حوالے سے حدیث میں آتا ہے: میں نے عیسی ابن مریم، موسی اور ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا، عیسی علیہ السلام سرخ فام،

گھنگریالے بالوں اور چوڑے سینے والے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام گندمی رنگ کے فربہ بدن تھے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اور ابراہیم علیہ السلام؟ ارشاد ہوا: ''اپنے ساتھی (محمد ﷺ) کو دیکھ لو۔''

مراد یہ کہ اللہ کے رسول کی شکل وصورت اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے انہیں عقل سلیم اور رشد و ہدایت سے نواز دیا تھا۔ وہ بڑے ہوئے تو انہیں رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور خلیل کا منصب عطا فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر مختلف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اپنے والد کو جس عمدہ انداز میں انہوں نے توحید کی دعوت دی، اُسے سورۂ مریم آیت: 41 سے 48 میں پڑھیے۔ یہاں اتنی بات لکھے دیتا ہوں کہ انہوں نے دعوت توحید کا آغاز اپنے گھر سے کیا اور اپنے مشرک باپ کو بڑے ادب سے تبلیغ کی مگر باپ نے اتنا ہی نامناسب رویہ اختیار کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کو سخت دھمکی دی۔ قیامت والے دن ان کے باپ کے انجام کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ وہ نجاست میں لتھڑا ہوا ایک بجو کی شکل میں نظر آئے گا، جسے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے لوگ سال میں ایک بار شہر سے نکل کر عید (قومی جشن) منانے جایا کرتے تھے۔ ان کے والد نے ان کو بھی جشن میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہ کہنے لگے: میں بیمار ہوں۔ آپ نے کلام میں توریہ کیا تا کہ آپ بتوں کو پاش پاش کر کے ان کے مذہب کی غلطی ظاہر کر سکیں اور سچے دین کی

حقانیت واضح کر سکیں۔ جب لوگ عید منانے چلے گئے اور آپ شہر میں اکیلے رہ گئے تو آپ جلدی سے لوگوں کی نظروں سے بچ کر بتوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان کو خوب سجا بنا کر ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان کے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کا مذاق اُڑایا اور از راہِ استہزا پوچھا: ''تم کھاتے کیوں نہیں؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم بولتے کیوں نہیں؟'' پھر انہوں نے ایک بسولا (لوہے کا ایک بھاری ہتھیار جس سے بڑھئی لکڑی کاٹتے ہیں) ہاتھ میں لیا۔ سوائے بڑے بت کے تمام بتوں کو مار مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ سوائے بڑے بت کے (سب کو توڑ دیا) کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ روایات میں ہے کہ بعد ازاں آپ علیہ السلام نے بسولا بڑے بت کے ہاتھ میں رکھ دیا تاکہ یہ تاثر ملے کہ اسے اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی عبادت ہوتے دیکھ کر غصہ آ گیا، اس لیے اس نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

جب لوگ جشن سے فارغ ہو کر آئے اور اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو کہنے لگے: ہمارے معبودوں کو کس نے توڑا ہے؟ یہ کام کس نے کیا ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے، اُسے ابراہیم کہتے ہیں۔ وہ ان کے عیب بیان کرتا ہے، ان کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ اسی نے پیچھے رہ کر انہیں توڑا ہے۔ لوگ کہنے لگے: اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہ رہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہی چاہتے تھے کہ سب لوگ جمع ہو جائیں تو تمام بت پرستوں کے سامنے ان کا عقیدہ غلط ہونے کی دلیل پیش کی جائے، چنانچہ سب لوگ جمع ہو

گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس مجمع عام کے سامنے آ گئے۔ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حشر تم نے کیا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ کام ان کے اس بڑے بت نے کیا ہوگا اگر یہ بولتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ اب قوم نے غور وفکر کیا۔ اپنے سر جھکا لیے، پھر اپنے آپ کو خود ملامت کرنے لگے کہ تم نے خود ہی غلطی کی کہ ان کے پاس کوئی چوکیدار اور محافظ نہیں چھوڑا۔ وہ حیرت زدہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہے یہ بُت باتیں نہیں کرتے، پھر آپ ہمیں کیوں کہتے ہیں کہ ان سے پوچھ لو۔

چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں جو جواب دیا وہ اس طرح تھا: ''پھر تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جو تمہیں نہ کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں، تف ہے تم پر اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ان پر بھی، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟'' [1]

قوم نے لاجواب ہونے پر وہی رویہ اپنایا جو ہر سرکش اور متکبر شکست کھانے پر اختیار کرتا ہے، لہٰذا مشرک قوم نے اکٹھے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نشانِ عبرت بنانے کا پروگرام بنایا۔ بت پرست کہنے لگے: ایک عمارت بناؤ، اس میں آگ جلاؤ، پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔ چنانچہ انہوں نے ہر ممکن جگہ سے ایندھن جمع کرنا شروع کیا۔ اور ایک مدت تک اکٹھا کرتے رہے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر کوئی عورت بیمار ہو جاتی تو یہی نذر مانتی کہ اگر مجھے شفا ہو گئی تو

[1] الأنبياء: 67,66/21۔

ابراہیم کو نذر آتش کرنے کے لیے اتنا ایندھن دوں گی۔ پھر عمارت کے اندر ایک وسیع ہموار جگہ میں تمام ایندھن رکھ کر اسے آگ لگا دی گئی۔ آگ روشن ہوئی' بھڑکی، اس کے شعلے بلند ہوئے اور اس سے اتنی چنگاریاں اڑنے لگیں جو اس سے پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھی تھیں۔ فارس کے بدوؤں میں سے ہیزن نامی کُردی شخص نے ایک منجنیق بنائی۔ یہ آلہ سب سے پہلے اسی شخص نے بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک دھنستا ہی چلا جائے گا۔ لوگوں نے آپ کو پکڑ کر باندھ دیا اور مشکیں کس دیں۔ اس وقت آپ کی زبان پر "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيل" کے الفاظ تھے، یعنی ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔...... اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی والی بن جا۔ سلامتی والی سے مراد یہ کہ اتنی ٹھنڈی نہ ہو جانا کہ حضرت ابراہیم کو اس کی ٹھنڈک سے تکلیف محسوس ہو۔

صحیح بخاری میں ام شریک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے چھپکلی کو ہلاک کرنے کا حکم دیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ تیز کرنے کے لیے پھونکیں مارتی تھی۔

حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صرف وہ رسیاں جلائیں جن سے وہ باندھے گئے تھے۔ بہر حال کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فتح پانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مغلوب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انبیاء میں فرمایا ہے: "اور ان لوگوں نے تو ابراہیم کا برا چاہا تھا مگر ہم نے انہی کو

نقصان میں ڈال دیا۔''[1] بلا شبہ یہ ایک کڑی آزمائش تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔

قرآن پاک نے ابوالانبیاء کا ایک سرکش اور ظالم بادشاہ کے ساتھ مناظرے کا ذکر بھی کیا ہے، وہ بابل کا بادشاہ تھا۔ اس کا نام نمرود بن کنعان تھا۔ یہ شخص پوری دنیا پر حکومت کرتا تھا۔ علماء کے قول کے مطابق پوری دنیا پر صرف چار بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ ان میں سے دو مومن اور دو کافر تھے۔ مومن تو ذوالقرنین اور حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اور کافر نمرود اور بخت نصر ہیں۔ علماء کے مطابق نمرود مسلسل چار سو سال تک بادشاہ رہا۔ مؤرخین کے مطابق ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مناظرہ اس روز ہوا جس دن وہ آگ سے نکلے۔

امام ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ نمرود نے اشیائے خوردنی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ لوگ غلہ لینے اس کے پاس جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے پاس غلہ لینے چلے گئے۔ اس سے پہلے ان دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت یہ مناظرہ ہو گیا۔ سورۂ بقرہ آیت: 258 میں اس کا ذکر ہے۔ نمرود نے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ اس کے سامنے دو آدمی پیش ہوئے جن کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک کو قتل کرنے کا حکم دیا اور دوسرے کو معاف کر دیا۔ اس طرح اس نے یہ

[1] الأنبياء 21:70.

فریب دینے کی کوشش کی کہ اس نے ایک کو موت دے دی ہے اور دوسرے کو زندگی بخش دی ہے۔ یہ بے کار بات تھی۔ اس کا موضوع مناظرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہر حال حضرت ابراہیم نے اُسے ایک اور دلیل دی کہ اللہ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، لہٰذا تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا! یہ بات سن کر کافر ششدر رہ گیا۔ وہ لاجواب ہو گیا تو اس نے حضرت ابراہیم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ واپس گھر کے قریب پہنچے تو دونوں بورے مٹی سے بھر لیے۔ دل میں سوچا کہ جب میں گھر پہنچوں گا تو گھر والے مطمئن ہو جائیں گے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے بورے اتارے اور سو گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ اٹھ کر بوروں کے پاس گئیں تو دیکھا کہ وہ عمدہ غلے سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کھانا تیار کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیدار ہوئے تو دیکھا کہ کھانا تیار ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ زوجہ محترمہ نے فرمایا کہ آپ جو غلہ لائے تھے اسی سے تیار کیا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ رزق اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر عطا فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ظالم کا خاتمہ اس طرح کیا کہ اس کی فوج پر اتنے مچھر بھیج دیے کہ ان کی چھاؤں میں سورج چھپ گیا، پھر ان مچھروں کو لشکر پر مسلط کر دیا۔ انہوں نے ان کا گوشت اس طرح نوچا کہ صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں۔ ایک مچھر نمرود کی ناک میں گھس گیا۔ اللہ نے اس کے ذریعے اسے ایک مدت تک عذاب میں مبتلا رکھا، اس کے سر پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جاتی تھیں حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم سے ہلاک ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کی ہٹ دھرمی، انکار اور کفر پر اصرار دیکھا تو ہجرت کا ارادہ فرمالیا۔ آپ نے شام کے علاقے کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جہان والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔ کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد انہوں نے مصر کا رخ کیا۔

مصر میں اس وقت جو شخص حکمران تھا اس کا نام رقیون تھا۔ وہ دراصل بابل ہی کا باشندہ تھا۔ ممکن ہے مصر جاتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم وطنی کے رشتے کو وجہ تعارف خیال کر لیا ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کے ساتھ جب مصر پہنچے تو مصر کے اس بادشاہ کو بتایا گیا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے ساتھ ایک حسین ترین خاتون ہے۔ اس نے آپ علیہ السلام کو بلا بھیجا اور پوچھا یہ عورت کون ہے؟ اس بادشاہ کا معاملہ یہ تھا کہ اگر وہ بھائی بہن کو ایک ساتھ پاتا تو بہن کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے۔ آپ نے حضرت سارہ سے جا کر کہا کہ اس وقت روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مؤمن موجود نہیں، اس نے مجھ سے تیرے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے۔ اب میری بات جھٹلا نہ دینا۔ بادشاہ نے سارہ کو طلب کیا۔ جب وہ اس کے سامنے پیش ہوئیں تو اس نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو چھونا چاہا تو اسے پکڑ لیا گیا، یعنی حرکت نہ کر سکا۔ اس نے کہا: تم میرے لیے اللہ سے دعا کرو تو میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی کی بیوی ہے تو اس نے حضرت

ابراہیم کی نہایت قدر ومنزلت کی۔ اور جب وہ وہاں سے وطن کو واپس ہوئے تو اس نے اپنی بیٹی ہاجرہ بھی ساتھ کر دی تا کہ اس نیک خاندان میں اس کی تربیت ہو اور وہ اپنے ہی ملک اور قدیم نسل کے باشندوں سے بیاہی جائے۔ اپنے مہمان نواز بادشاہ کی خوش آیند آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کر لیا۔ اللہ نے انہیں پہلا بیٹا اسی کے بطن سے عنایت کیا۔ اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھا گیا۔

یہ جو اوپر والا واقعہ ہے وہ میں نے مشہور سیرت نگار علامہ سلیمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت یافتہ کتاب رحمۃ للعالمین ﷺ سے لیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت ہاجرہ ایک کنیز نہ تھیں بلکہ ایک شہزادی تھیں۔ الرحیق المختوم کے مؤلف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس طرف گئے ہیں کہ بادشاہ حادثے کی نوعیت سے سمجھ گیا کہ حضرت سارہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت خاص اور مقرب بندی ہیں۔ وہ سیدہ سارہ کی اس خصوصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو ان کی خدمت میں دے دیا، پھر سیدہ سارہ نے حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔ قاضی صاحب نے بہت سے دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ہاجرہ لونڈی نہیں تھیں بلکہ شاہ مصر کی بیٹی تھیں اور ان کی ایک اور خوبی بحوالہ تورات یہ بھی بیان کی ہے کہ اللہ کے ہاں بھی ان کا درجہ بالاتر تھا۔ اللہ کے فرشتے ہاجرہ کے سامنے خود آتے اور اللہ کا حکم پہنچایا کرتے تھے۔ مگر سارہ بی بی کے سامنے کبھی کوئی فرشتہ نہیں آیا۔ بہر حال حقائق کے متلاشی قاضی صاحب کی

رحمتہ للعالمین کا مطالعہ فرمائیں۔ ان پر حقیقت حال واضح ہو جائے گی۔[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کو ہمراہ لے کر فلسطین واپس آئے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ایک فرزند ارجمند اسماعیل علیہ السلام عطا فرمایا۔ اس پر حضرت سارہ کو جو بے اولاد تھیں بڑی غیرت آئی۔ اسی دوران حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی طرف سے اشارہ پا کر دونوں ماں بیٹے کو ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آپ اللہ کے حکم سے ان دونوں کو لے کر حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں ایک بے آب و گیاہ وادی میں بیت اللہ شریف کے قریب ٹھہرا دیا۔[2]

① رحمۃ للعالمین: 35,34/1 ۔

② ملخصا عن البدایۃ والنہایۃ: 164-149/1 ۔

2

اللہ کے رسول ﷺ کے آباء واجداد

ہجرت کے سفر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہاران کے بیٹے لوط اور آپ کی اہلیہ سارہ بھی ہمراہ تھیں۔ انہوں نے بابل، یعنی کلدانیوں کی سرزمین سے ہجرت کرتے ہوئے کنعانیوں کی سرزمین کا رخ کیا۔ یہ لوگ حران کے مقام پر رہائش پذیر ہوئے ، یہی بیت المقدس کا علاقہ ہے۔حران کے باشندے بھی ستاروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوااس وقت دنیا بھر کے لوگ کافر تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سیدہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو میاں بیوی میں یہ باتیں ہوئیں۔ ہاجرہ :ہمیں یہاں کس کے پاس چھوڑ چلے ؟ حضرت ابراہیم : اللہ کے پاس۔ یہ جواب سن کر کہنے لگیں: تو پھر میں اپنے اللہ پر راضی ہوں ۔اس وقت بیت اللہ شریف نہ تھا۔صرف

ٹیلے کی طرح ابھری ہوئی زمین تھی۔ سیلاب آتا تو دائیں بائیں کترا کر نکل جاتا تھا۔ وہیں بالائی حصے میں ایک بہت بڑا درخت بھی تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں آج کل زم زم کا چشمہ ہے۔ حضرت ابراہیم نے اسی درخت کے پاس حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑا تھا۔ اس وقت مکہ میں پانی تھا نہ کوئی آدم زاد۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک توشہ دان میں کھجوریں اور ایک مشکیزے میں پانی رکھ دیا اور خود واپس فلسطین چلے گئے۔ چند دن کے بعد کھجوریں اور پانی ختم ہوگیا۔ اب حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کو پیاس لگی۔ بچہ پیاس کی وجہ سے بے چین ہوگیا۔ وہ اسے تڑپتا نہ دیکھ سکیں، اٹھ کر چل دیں۔ انہیں اپنے قریب کی زمین سے صفا پہاڑ سب سے قریب معلوم ہوا، وہ اس پر چڑھ گئیں۔ وادی کی طرف منہ کر کے دیکھا کہ کیا کوئی انسان نظر آتا ہے؟ ان کی نظر تھک کر لوٹ آئی۔ کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ وہ صفا سے اتریں۔ وادی کے نشیب میں پہنچیں تو قمیص کا دامن جو زمین تک پہنچتا تھا، اٹھا کر یوں بھاگیں جس طرح کوئی پریشان یا مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ حتی کہ وادی کو پار کرلیا۔ وہ مروہ تک پہنچیں تو اس پر چڑھ گئیں اور دیکھا کہ کیا کوئی نظر آتا ہے؟ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہ عالم اضطراب میں صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتی رہیں۔ انہوں نے سات دفعہ اسی طرح چکر کاٹے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: لوگ اسی وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان دوڑتے ہیں۔

جب وہ آخری چکر میں مروہ پر پہنچیں تو انہیں ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ کھڑا ہے۔ اس نے اپنی

ایڑی یا پر سے زمین کھودی تو پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ وہاں پہنچیں، پانی کو حوض کی شکل دینے لگیں۔ چلو بھر بھر کے مشکیزے میں ڈالنے لگیں۔ ان کے مشکیزہ بھرنے کے بعد پانی پھر نکل آیا۔ انہوں نے خود پیا، اپنے بچے کو پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا کہ آپ ہلاکت کا اندیشہ نہ کریں۔ یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر یہ بچہ اور اس کے والد مل کر کریں گے۔

اللہ اپنے بندوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو بہنے دیتیں ...... یا فرمایا اگر وہ پانی سے چلو نہ بھرتیں...... تو وہ ایک بہتے ہوئے چشمے کی صورت اختیار کر لیتا۔ کچھ وقت گزرا تو کدا کی طرف سے بنو جرہم کا ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ قافلے نے مکہ کے نشیبی علاقے میں قیام کیا۔ قافلے والوں کو ایک پرندہ منڈلاتا نظر آیا۔ وہ کہنے لگے: یہ پرندہ تو پانی پر منڈلایا کرتا ہے۔ یہاں تو پانی نہیں ملتا۔ انہوں نے دو آدمیوں کو بھیجا کہ جا کر دیکھو حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے پانی کا کنواں دیکھا تو آ کر اپنے قبیلے والوں کو اطلاع دی۔ سارا قافلہ وہاں آ گیا۔

وہاں حضرت حاجرہ تھیں۔ قافلے والے ان سے کہنے لگے: کیا آپ ہمیں یہاں خیمہ زن ہونے اور کنویں کا پانی استعمال کرنے دیں گی؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اس کنویں پر ان کا کوئی حق ملکیت نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اپنے اور عزیزوں کو بھی بلوالیا۔ اس طرح وہاں کئی گھر بس گئے۔ یوں مکہ مکرمہ میں آبادی کا آغاز ہوا۔ بنو جرہم کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ پہلے مکہ کے گرد وپیش کی وادیوں میں سکونت پذیر تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ لوگ رہائش کی غرض سے مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی آمد کے بعد اور ان کے جوان ہونے سے پہلے وارد ہوئے تھے۔ تاہم اس وادی سے ان کا گزر پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنی بار اپنی بیوی اور بیٹے سے ملنے کے لیے مکہ آئے؟ اس کی تفصیل کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ تاہم کم از کم وہ چار مرتبہ یقیناً تشریف لائے۔

ان چار سفروں میں سب سے پہلا سفر تو وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العزت کے حکم پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا فقید المثال اہتمام کیا۔ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ بیٹے سے ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ حکم الٰہی ہے۔ باپ بیٹا دونوں تیار ہو گئے۔ دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور پوری قوت سے گلے پر چھری چلا دی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی: اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اللہ نے انہیں فدیے میں ایک عظیم ذبیحہ عطا فرمایا۔ اس سنت ابراہیمی کی یاد آج تک منائی جاتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان عید الاضحیٰ کے روز جانور ذبح کرتے ہیں اور یہ عمل خیر قیامت تک کرتے رہیں گے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ جرہم قبیلہ مکہ میں آباد ہو گیا۔ حضرت اسماعیل

جوان ہوئے تو انہوں نے ان سے عربی زبان سیکھ لی۔ اور انہی کے خاندان میں شادی کرلی۔ ادھر حضرت حاجرہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مکہ آئے۔ حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ بہو موجود تھی۔ اس سے حالات دریافت کیے۔ اس نے تنگ دستی کی شکایت کی۔ فرمایا: جب اسماعیل گھر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل گھر آئے تو بیوی نے سارا واقعہ بیان کیا کہ اس طرح ایک بزرگ آئے تھے اور وہ یہ پیغام دے گئے ہیں۔ کہنے لگے: وہ میرے والد گرامی تھے۔ گھر کی چوکھٹ تم ہو، تم کو تبدیل کرنے کا حکم دے گئے ہیں۔ انہوں نے بیوی کو طلاق دے دی۔ اب انہوں نے دوبارہ شادی کی۔ یہ شادی بنو جرہم کے سردار مضاض بن عمرو کی بیٹی سے ہوئی۔

حضرت ابراہیم ایک مرتبہ پھر مکہ آئے۔ اتفاق سے اس مرتبہ بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ بہو سے ملاقات ہوئی، گھر کے حالات پوچھے۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بتایا کہ گھر میں خیر و برکت ہے۔ شکار کا گوشت کھاتے ہیں۔ آپ نے اسے کہا کہ تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ برقرار رکھے۔ چوتھی مرتبہ جب حضرت ابرہیم علیہ السلام تشریف لائے تو حضرت اسماعیل زمزم کے پاس بیٹھے تیر گھڑ رہے تھے۔ والد گرامی کو دیکھا تو نہایت خوش ہوئے، والد کی بے حد عزت و تکریم کی۔ بڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس سفر میں دونوں باپ بیٹے نے مل کر بیت

اللہ شریف تعمیر کیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساری دنیا کے لوگوں کو حج کے لیے آنے کی دعوت دی۔ [1]

حضرت اسماعیل کو اللہ تعالیٰ نے مضاض کی بیٹی سے بارہ بیٹے عطا فرمائے۔ جن میں سے نابت اور قیدار زیادہ مشہور ہوئے۔ قیدار مکہ میں مقیم رہے۔ یہی ہمارے پیارے رسول ﷺ کے جد امجد تھے۔ [2]

---

[1] البداية والنهاية: 1/164-166 .

[2] البداية والنهاية: 1/201,202 .

3

خاندان نبوت کی عظمت و وجاہت

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مادری زبان قبطی تھی، پدری زبان عبرانی تھی اور ان کے سسرال عربی زبان والے تھے۔ انہی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی میں کمال پیدا کیا۔ انہوں نے 137 سال عمر پائی۔ عدنان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں اکیسویں پشت میں ہیں۔ یہ قیدار کی اولاد میں سے تھے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سلسلہ نسب بیان فرماتے تو عدنان پر پہنچ کر رک جاتے۔ آگے نہ بڑھتے۔ فرماتے تھے کہ ماہرین انساب غلط کہتے ہیں، تاہم علماء کی تحقیق کے مطابق عدنان اور حضرت ابراہیم کے درمیان چالیس پشتیں ہیں۔[1]

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے خلق کی تخلیق فرمائی تو مجھے سب سے اچھے گروہ میں رکھا، پھر

---

[1] قلب جزيرة العرب، ص: 237،230، المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 2/191-194.

ان کے بھی دو گروہوں میں سب سے زیادہ اچھے گروہ میں مجھے رکھا۔ پھر قبائل کو چنا تو مجھے سب سے اچھے قبیلے میں رکھا، پھر گھرانوں کو چنا تو مجھے سب سے اچھے گھرانے میں رکھا، لہٰذا میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی سب سے اچھا ہوں۔ اور اپنے گھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے ممتاز ہوں۔[1] عدنان جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان کے بارے میں قاضی سلیمان منصور پوری فرماتے ہیں ان کا من جانب اللہ محترم ہونا اس طرح ثابت ہے کہ بخت نصر نے جب عربوں پر پہلا حملہ کیا تب ارمیا اور برخیا علیہما السلام نے بخت نصر کو بتا دیا تھا کہ عدنان کو چھوڑ کر دیگر قبائل پر حملہ کرنے کی اسے اجازت ہے، چنانچہ بخت نصر نے عدنان کو چھوڑ کر دیگر قبائل پر حملہ کیا اور انہیں اسیر کر کے لے گیا۔ ان اسیروں کو اُس نے وادی فرات میں لے جا کر آباد کیا۔ انہی لوگوں نے عرب کی قدیم سلطنت انبار کی بنیاد رکھی۔

عدنان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام "معد" تھا۔ ان کا نام نسب نبوی میں آتا ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام "وعک" تھا انہوں نے حجاز سے اٹھ کر یمن میں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ معد کے بیٹے نزار تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نسب ان سے ملتا ہے۔ ان کی اولاد مضر میں سے کنانہ تھے۔ کنانہ کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ کنانہ سے قریش کا قبیلہ وجود میں آیا۔ ان کا نام فہر تھا۔ ان کے دور میں حسان حاکم یمن اپنی فوج لے کر مکہ معظّمہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو گرا کر اس کا ملبہ یمن لے

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3608,3607.

جائے اور وہاں کعبہ تعمیر کرے۔ فہر نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ حسان کو شکست ہوئی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تین سال تک قید رہا، پھر فہر نے اسے آزاد کر دیا۔ حسان یمن واپس جا رہا تھا کہ راستے میں مر گیا۔ اس فتح سے فہر کی عظمت وشوکت کا دبدبہ پورے عرب میں قائم ہو گیا۔[1]

لغت حجاز میں ''قریش'' وہیل مچھلی کو کہتے ہیں۔ یہ سمندر کا سب سے بڑا جانور ہے۔ فہر اور ان کی اولاد کو قریش اس لیے کہا جانے لگا کہ وہ عرب بھر میں تمام قبائل سے زیادہ طاقت ور اور عظیم الشان تھے۔[2] اس سے پہلے کہ قریش اور ان کے بعد کے حالات بیان کیے جائیں، تھوڑی دیر کے لیے ہم مکہ کی امارت کے حوالے سے بات کر کے دوبارہ اللہ کے رسول ﷺ کے آباء واجداد کی بات کریں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تاحیات مکہ کے متولی رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نابت اور قیدار اس کے متولی بنے۔ ان کی معیشت کا دارومدار یمن اور مصر وشام کی تجارت پر تھا۔

ان کے بعد ان کے نانا مضاض بن عمرو جرہمی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔ اور مکہ کی سربراہی بنو جرہم کی طرف منتقل ہو گئی۔ ایک لمبی مدت تک وہ عملاً مکہ کے والی بنے رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام چونکہ بیت اللہ کے بانی ومعمار تھے، اس لیے ان کی اولاد کو ایک باوقار مقام حاصل رہا۔ لیکن اقتدار واختیار میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس حساب سے مکہ میں قبیلہ جرہم کا وجود کوئی دو ہزار ایک سو برس تک رہا۔ ان کی حکمرانی دو ہزار

---

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 227,226/2 .

[2] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 227/2 .

سال تک رہی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اس عرصے میں گوشہ گمنامی سے نہ نکل سکی۔ یہاں تک کہ بخت نصر کے ظہور سے کچھ پہلے بنو جرہم کی طاقت کمزور پڑ گئی۔ اور مکہ کے افق پر عدنان کا سیاسی ستارہ جگمگانا شروع ہوا۔ مکہ میں بنو جرہم کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ انہیں تنگ دستی نے آگھیرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے زائرین بیت اللہ پر زیادتیاں شروع کر دیں۔ وہ بیت اللہ کا مال کھانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ بنو عدنان ان کی اس حالت سے سخت نالاں تھے اور ان کی حرکات پر کڑھتے رہتے تھے، چنانچہ بنو خزاعہ نے اس نفرت سے فائدہ اٹھایا، انہوں نے بنو عدنان کی حمایت سے بنو جرہم کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور دوسری صدی عیسوی کے وسط میں بنو جرہم کو مکہ سے بے دخل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ اہل فارس پچھلے دور میں بیت اللہ کے لیے اموال اور جواہرات بھیجتے رہتے تھے۔ ساسان بن بابک نے سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، جواہرات، تلواریں اور بہت سا سونا بھیجا تھا۔ عمرو بن حارث جرہمی نے یہ سارا مال زمزم کے کنویں میں دفن کر دیا۔ اور خود یمن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب بنو خزاعہ نے مکہ پر تنہا اپنی حکمرانی قائم کی۔ ان کا اقتدار تین سو برس تک قائم رہا۔ حتی کہ قصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔ قصی ابھی ماں کی گود میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ نے ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ اور بچے سمیت خاوند کے ساتھ شام چلی گئی۔ قصی جوان ہوئے تو مکہ واپس آئے اور ان کی شادی مکہ کے والی حُلیل خزاعی

کی بیٹی حُبّی سے ہوگئی۔ حُلیل کا انتقال ہوا تو مکہ اور بیت اللہ کی تولیت کے لیے بنو خزاعہ اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش فتح یاب ہوئے اور قصی مکہ اور بیت اللہ پر قابض ہو گئے۔

قصی کا مکہ پر قبضہ اور تولیت 440ء کی بات ہے۔ انہوں نے بہت سے قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔ حرم کعبہ کے شمال میں دارالندوہ تعمیر کیا۔ اس کا دروازہ بیت اللہ کی طرف تھا۔ یہ درحقیقت قریش کی پارلیمنٹ تھی۔ جہاں تمام اہم معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں جنگ کی تیاری بھی ہوتی۔ قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے۔ نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے تھے۔ انہوں نے سقایہ (یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا) اور رفادہ (حجاج کی ضیافت کرنا) جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا قائم کیا۔ تمام قریش کو جمع کر کے انہیں حجاج کی خدمت اور ضیافت کے لیے تیار کیا اور ان پر واضح کیا کہ لوگ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے آتے ہیں۔ ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے۔ ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ مکرمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ انہوں نے چمڑے کے حوض بنائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قریش کا لقب انہی کو ملا تھا۔ مؤرخین اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا تھا۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔ جن میں عبدالدار اور عبد مناف نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مرتے وقت انہوں نے تمام مناصب اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو سونپے، تاہم

عبدمناف نے اپنی خصوصیات کے باعث قریش کی سیادت حاصل کر لی۔ اور انہی کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاص خاندان ہے۔ عبدمناف کے چھ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہاشم نہایت مالدار اور بااثر تھے۔ انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ بنوعبدالدار سے حرم کے مناصب واپس لے لیے جائیں کیونکہ وہ لوگ اس منصب کے اہل نہیں۔ عبدالدار کے لوگوں نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ بنوعبدالدار نے سقایہ اور رفادہ بنو ہاشم کو واپس کر دیا۔[1] ہاشم اپنے قبیلے کے سردار مقرر ہوئے۔ اپنی ذمہ داری بڑی خوبی سے ادا کرتے تھے۔ انہوں نے حجاج کی خدمت اس شاندار طریقے سے کی کہ لوگ مثالیں دینے لگے۔ تجارت کو خوب ترقی دی۔ قیصر روم سے خط وکتابت کی اور اس سے یہ فرمان حاصل کر لیا کہ قریش اس کے ملک میں سامان تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ اہل عرب سردیوں میں یمن اور حبشہ کا سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں انگوریہ (موجودہ دور میں ترکی کا دارالحکومت انقرہ) ایشائے کوچک کا مشہور شہر تھا۔ یہاں روم کا بادشاہ قیصر کے لقب سے رہتا تھا۔ قریش انگوریہ جاتے تو قیصر نہایت عزت سے پیش آتا اور ان کا استقبال کرتا تھا۔ اس دور میں قافلوں کے لیے راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل کے دورے کیے اور ان سے معاہدے کیے کہ وہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ اس کے صلے میں کاروان

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 138,137/1 .

قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں لے کر خود بہم پہنچائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہی سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔ ہاشم نے اس قحط میں روٹیوں کا چورا کر کے لوگوں کو کھلایا۔ اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا۔ عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں۔ جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔ ایک بار وہ تجارت کی غرض سے شام گئے۔ راستہ میں مدینہ ٹھہرے۔ وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا۔ بازار گئے تو ایک عورت کو دیکھا۔ اس کی حرکات وسکنات سے شرافت وفراست کا اظہار ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت حسین وجمیل بھی تھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام سلمیٰ ہے اور بنونجار سے تعلق ہے۔ اس کا والد بھی سردار قبیلہ تھا۔ ہاشم نے شادی کی درخواست کی تو قبول کر لی گئی۔ نکاح ہوگیا۔ انہوں نے مدینہ میں کچھ دیر قیام کیا۔ ہاشم وہاں سے فلسطین تشریف لے گئے۔ بعد میں سلمیٰ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ ہاشم غزہ کے شہر میں مقیم تھے۔ وہیں بیمار ہو کر وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ادھر ان کے بیٹے شیبہ مدینہ ہی میں پرورش پاتے رہے۔ جب ان کی عمر 8 سال ہوئی تو ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا مدینہ گئے۔ بھتیجے سے ملاقات ہوئی۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا، تین دن وہاں رہے۔ شیبہ کی والدہ سے بچے کو مکہ لے جانے کی خواہش ظاہر کی اور چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ یہی ہمارے پیارے رسول ﷺ کے دادا محترم ہیں۔ شیبہ کا

لفظی معنی بوڑھا ہے۔ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی چندیا میں چند بال سفید تھے، اس لیے شیبہ نام رکھا گیا۔ مکہ آئے تو ان کے چچا مطلب نے بیٹوں سے بڑھ کر نازونعم سے پرورش اور تربیت کی۔ اس احسان مندی کی قبولیت اور اظہار کے طور پر یہ تمام عمر ''عبدالمطلب'' یعنی مطلب کے غلام کہلاتے رہے۔ اصلی نام پر یہ لقب اس قدر غالب آ گیا کہ عبدالمطلب ہی ان کا اصل نام سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شہرت سید قریش کے لقب سے تھی۔ ان کا نام شیبۃ الحمد' فیاض اور مُطْعِمُ طَيْرِ السَّمَاءِ بھی آتا ہے۔ یہ بلاشبہ سید قریش تھے۔ قریش میں ان کے اس خطاب کا کوئی منکر نہ تھا۔[1]

ہاشم کے تین اور بھائی مطلب، نوفل اور عبدشمس تھے۔ اپنے باپ کے بعد جب ہاشم قوم کے سردار بنے تو ان کے بھتیجے امیہ بن عبدشمس نے ان کی سرداری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ عسقلان کا ایک کاہن منصف ٹھہرا۔ اس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دیا اور امیہ کو دس برس کے لیے جلاوطن ہونا پڑا۔ امیہ کو اپنے چچا ہاشم سے جو اختلاف شروع ہو گیا تھا، وہ آئندہ نسلوں میں بھی منتقل ہوا۔ ہاشم اور مطلب کی اولاد ایک جانب اور نوفل اور عبدشمس کی اولاد دوسری جانب رہا کرتی تھی۔ ان دو خاندانوں کی باہمی منافرت اور عداوت کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے وجودِ مسعود کی برکت تھی کہ نسلوں کی عداوتیں آپ کی تشریف آوری کے بعد معدوم ہو گئیں۔

[1] المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: 1/205-214 .

4

جد رسول کریم کے کارنامے

عبدالمطلب کے کارناموں میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے زم زم کا وہ کنواں جو بنو جرہم نے بند کر رکھا تھا اور امتداد زمانہ سے کسی کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ کنواں کہاں تھا اس کا کھوج نکالا۔ کتب تاریخ میں ہے کہ عبدالمطلب نے تین روز متواتر یہ خواب دیکھا کہ کنواں نکالو، پھر خواب ہی میں ان کو اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ انہوں نے بیدار ہونے کے بعد کھدائی شروع کی۔ اس وقت ان کا ایک ہی بیٹا حارث تھا۔ کھدائی کے دوران بنو جرہم کی دفن کردہ اشیاء، یعنی سونے کے دو ہرن، تلواریں اور زرہیں برآمد ہو گئیں۔ جب زمزم کا کنواں نمودار ہو گیا تو قریش نے عبدالمطلب سے جھگڑا شروع کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی کھدائی میں شامل کر لو۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کام کے لیے مخصوص و مامور ہوں۔ پھر بھی قریش نے اصرار کیا۔ جھگڑا ختم کرنے کے لیے بنو سعد کی ایک کاہنہ عورت کا

انتخاب ہوا کہ جو وہ فیصلہ کر دے فریقین کو منظور ہوگا۔ یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ چند ایسی علامات کا ظہور ہوا جن سے قریش سمجھ گئے کہ زمزم کا کام قدرت کی طرف سے عبدالمطلب ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس موقع پر عبدالمطلب نے منت مانی کی اگر ان کے ہاں دس بیٹے ہوئے اور سب کے سب جوان ہو گئے تو وہ ایک بیٹے کو کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔ مطلب کی وفات یمن میں ردمان کے مقام پر ہوئی تھی۔ ان کے چھوڑے ہوئے تمام مناصب عبدالمطلب کو حاصل ہوئے۔ مگر ان کے چچا نوفل نے عبدالمطلب کے صحن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عبدالمطلب نے قریش کے لوگوں سے مدد چاہی مگر انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے اور تمہارے چچا کے درمیان دخل اندازی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ عبدالمطلب نے مدینہ میں اپنے ننھیال کو خط لکھا اور بنونجار سے مدد طلب کی۔ ان کا ماموں ابوسعد بن عدی 80 سواروں کے ساتھ مکہ آیا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ماموں جان گھر تشریف لے چلیں۔ مگر ابوسعد نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم! پہلے میں نوفل کا سامنا کروں گا۔ وہ حطیم میں مشائخ قریش کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ابو سعد اس کے سر پر کھڑا ہو گیا، اس نے تلوار بے نیام کی اور کہا کہ اس گھر کے رب کی قسم! اگر تم نے میرے بھانجے کی زمین واپس نہ کی تو تمہارے بدن میں یہ تلوار گھونپ دوں گا۔ نوفل نے کہا: مطمئن ہو جاؤ۔ میں نے زمین واپس کر دی۔ ابوسعد نے قریش کو گواہ بنایا۔ مکہ میں تین دن ٹھہرا اور عمرہ ادا کر کے مدینہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد نوفل نے بنوعبدشمس سے بنو ہاشم کے خلاف باہمی تعاون کا سمجھوتہ کیا۔

ادھر عبدِ مناف کی ماں قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح بنونجار نے عبدالمطلب کی مدد کی ہے۔ ہمارا بھی اس کی مدد کرنے کا حق ہے کہ یہ بھی ہماری اولاد ہے، چنانچہ بنوخزاعہ نے دارالندوہ جا کر بنوعبدشمس اور بنونوفل کے خلاف تعاون کا عہدو پیمان کیا جو آگے چل کر فتح مکہ میں مسلمانوں کے کام آیا۔ ①

سردار عبدالمطلب کے دور میں ابرہہ حبشی نے بیت اللہ کو ڈھانے کا پروگرام بنایا۔ یہ واقعہ بڑا معروف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابرہہ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر جنرل تھا۔ اس نے دیکھا کہ اہل عرب بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، دیکھا دیکھی اس نے بھی صنعاء میں ایک بہت بڑا کلیسا بنوایا۔ اس کی خواہش تھی کہ عرب کے حج کا رخ اسی کی طرف پھر جائے۔ یہ خبر بنوکنانہ کے ایک آدمی کو ہوئی تو اس نے اس کلیسا میں رفع حاجت کر ڈالی۔ ابرہہ کو سخت غصہ آیا۔ اس نے ساٹھ ہزار کا لشکر جرار لے کر بیت اللہ پر چڑھائی کر دی۔ اس کے لشکر میں 9 یا13 ہاتھی تھے۔ اسی لیے ان کو اصحاب فیل کہا گیا۔ جب یہ لشکر لے کر طائف کے قریب پہنچا تو بنو ثقیف نے راستہ بتانے کے لیے ابو رغال نامی ایک آدمی اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین میل دور رہ گیا تو ابو رغال راستہ ہی میں مرگیا۔ ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کے فوجیوں کو آگے بڑھایا انہوں نے اہل تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لیے۔ ان میں سردار عبدالمطلب کے بھی دوسو اونٹ شامل تھے۔ بیت اللہ کو ڈھانے کی خبر جب اہل مکہ کو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے

---

① مختصر سیرۃ الرسول للشیخ محمد بن عبدالوہاب، ص:42،41۔

لڑنے کی طاقت نہیں۔ یہ اللہ کا گھر ہے وہ چاہے تو اپنے گھر کو بچا لے۔ ادھر ابرہہ نے اپنا ایلچی بھجوایا کہ میری اہل مکہ سے کوئی لڑائی نہیں میں تو صرف بیت اللہ کو ڈھانے آیا ہوں۔ ایلچی کے کہنے پر سردار عبدالمطلب کی ابرہہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ انہیں دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا وہ اپنے تخت سے اتر کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے کہا: آپ اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں مگر یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دین کا مرجع ہے اس کی کوئی بات نہیں کر رہے؟ انہوں نے کہا: میں اونٹوں کا مالک ہوں۔ اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر تو اس کا ایک رب ہے۔ وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے کہا کہ وہ اس کو مجھ سے بچا نہ سکے گا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ آپ جانیں اور وہ جانے۔ عبدالمطلب نے یہ بھی کہا: یہ اللہ کا گھر ہے۔ آج تک اس نے کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ابرہہ نے ان کے اونٹ واپس کر دیے۔

اہل مکہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ عبدالمطلب نے چند سرداروں کو ساتھ لیا اور حرم میں اللہ سے بیت اللہ کی حفاظت کی دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ نے لشکر کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ارسال کر دیے جو اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے تھے۔ انہوں نے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس سے سارا لشکر ہلاک ہو گیا۔ [1]

جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل کہتے ہیں۔ اسی سال اللہ

---

[1] البدایۃ والنھایۃ: 2/181-190.

کے رسول ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا جبکہ اس کے 50 دن کے بعد ربیع الاول کے مہینہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی ولادت با سعادت ہوئی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ نے اسلام یا کفر یا کسی اور خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی، یعنی ابولہب، ابو طالب، عبداللہ، حمزہ اور عباس۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب لوگوں کا دیا ہوا لقب ہے۔لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین و جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہیں، فارسی میں آتشِ رخسار کہا جاتا ہے۔عبدالمطلب نے منت مانی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ اللہ نے آرزو پوری کی۔ وہ بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے۔ پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو۔ دیکھو کس کا نام نکلتا ہے۔ اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا۔ یہ انہیں لے کر قربان گاہ چلے گئے۔عبداللہ کی بہنیں ساتھ تھیں۔ وہ رونے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بدلے دس اونٹ قربان کیجیے۔ انہیں چھوڑ دیجیے۔عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو۔ اتفاق سے پھر عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ اب دس کی بجائے بیس اونٹ کر دیجیے۔ یہاں تک بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ نکل آیا۔ سردار عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کیے اور عبداللہ بچ گئے۔

اس واقعہ سے پہلے عرب میں انسانی دیت (خون بہا) کے لیے دس اونٹ مقرر تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد دیت کی مقدار عام طور پر سو اونٹ ہو گئی۔ گویا عبدالمطلب کے خلوص اور سردار عبداللہ کی اطاعت پدر کا یہ نتیجہ نکلا کہ سارے علاقے میں انسان کی قدر و قیمت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ دیت کی مقدار میں دس گنا اضافہ سے وارداتِ قتل میں بہت نمایاں کمی ہو گئی ہو گی۔ اس طرح یہ واقعہ تمام جزیرہ عرب اور بنی نوع انسان کے لیے خیرات و برکات کا موجب بن گیا۔

بلا شبہ جس گراں قدر سردار کے فرزند کو رحمت للعالمین ﷺ بننا تھا اس کے آباء کا بھی بنی نوع انسان کے لیے ایسا ہی محسن ہونا ضروری تھا۔

عبداللہ قربانی کی زد سے بچ گئے تو والد کو شادی کی فکر ہوئی۔ امام ابن کثیر نے متعدد حوالوں سے لکھا ہے کہ کئی عورتیں عبداللہ سے شادی کی آرزومند تھیں۔ ان میں ورقہ بن نوفل کی بہن ام قتال اور فاطمہ نامی ایک کاہنہ بھی شامل تھیں۔ بلکہ فاطمہ نے تو انہیں سو اونٹوں کی پیش کش بھی کی۔ مگر عبداللہ نے اس کے جواب میں دو شعر سنائے اور اپنے والد کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ میں محترم قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ فاطمہ نے ان سے اظہار محبت کیا اور اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سو اونٹوں کا عطیہ بھی دینا چاہا۔ اس کے جواب میں سردار عبداللہ نے جو اشعار پڑھے ان کا ترجمہ بھی بڑا عمدہ ہے جو سردار عبداللہ کے خاندانی پس منظر اور شرافت و نجابت کا اظہار و اعلان کرتا ہے۔ عبداللہ نے جو اشعار

پڑھے، اُن کا ترجمہ یہ ہے:

''فعل حرام کے ارتکاب سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔ حلال کو بے شک پسند کرتا ہوں۔ مگر اس کے لیے اعلان ضروری ہے۔ تم مجھے بہکاتی اور پھسلاتی ہو مگر شریف آدمی کو لازم ہے کہ وہ اپنی عزت اور دین کی حفاظت کرے۔''

ام قتال نے دیکھا کہ عبدالمطلب اور عبداللہ دونوں باپ بیٹے کہیں جا رہے ہیں۔ اس نے عبداللہ سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ بولے مجھے میرے والد ساتھ لیے جا رہے ہیں جہاں بھی یہ لے جائیں گے میں وہیں چلا جاؤں گا۔ ام قتال کہنے لگی: کیا تم قربانی کے اونٹ ہو کہ تمہاری نکیل پکڑ کر جو چاہے اور جہاں چاہے، لے جائے۔ عبداللہ نے جواب دیا: یہ میرے والد ہیں۔ میں ان کی حکم عدولی کر سکتا ہوں نہ ان سے جدائی برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے والد کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ انہیں وہب بن عبد مناف بن زہرہ کے پاس لے گئے، جو ان دنوں اپنے قبیلے بنو زہرہ کے سردار تھے۔ ان سے درخواست کی کہ وہ عبداللہ کو اپنی فرزندی میں لے لیں، یعنی اپنی بیٹی آمنہ سے ان کی شادی کر دیں۔ چونکہ دونوں خاندانوں کا تعلق بنو اسماعیل سے تھا، اس لیے وہب بن عبد مناف نے نہایت خوش دلی سے یہ رشتہ منظور کیا اور عقد ہو گیا۔ سیدہ آمنہ اپنے قبیلے میں سیدۃ النساء کہلاتی تھیں۔

اس موقع پر خود سردار عبدالمطلب نے سیدہ آمنہ کے چچا کی بیٹی ہالہ بنت وہیب سے شادی کی۔ حضرت حمزہ اور سیدہ صفیہ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ اس بنا پر حضرت

حمزہ آپ ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ [1]

اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ دولہا شادی کے بعد 3 دن تک سسرال ہی میں رہتا تھا، اسی کے مطابق عبداللہ بھی تین روز یثرب میں رہے۔ پھر گھر چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر 25 سال کی تھی۔ سیدہ آمنہ نکاح کے بعد پہلے ہی ہفتہ میں امانت دارِ نورِ نبوت بن گئیں۔ ان کو خواب میں بتایا گیا کہ اپنے بیٹے کا نام احمد رکھنا، چنانچہ والدہ نے آپ ﷺ کا نام احمد رکھا اور دادا نے محمد تجویز کیا۔ دونوں مبارک نام اللہ کے رسول ﷺ کے ذاتی نام ہیں۔ اس خواب کے بعد سیدہ آمنہ کو یقین ہو گیا کہ ان کا فرزند نہایت مبارک و مسعود ہوگا، چنانچہ جب حلیمہ سعدیہ نے اللہ کے رسول ﷺ کو گود میں لینے سے اس لیے تامل کیا کہ وہ یتیم بچے ہیں تو سیدہ نے فرمایا تھا: اے دایہ! اس بچے سے مطمئن رہو، اس کی شان بہت بُلند پایہ ہونے والی ہے۔

سردار عبداللہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ملک شام تجارت کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی پر یثرب میں ٹھہر گئے کہ ان کے والد نے حکم دیا تھا کہ وہاں کھجوروں کا سودا کریں۔ وہیں بیمار ہوئے اور عالم آخرت کو سدھار گئے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے والدین کے اسمائے گرامی پر غور کیجیے۔ والد عبداللہ ہیں، والدہ آمنہ ہیں۔ اس دور کی تاریخ پر ذرا نظر دوڑائیں، ہر ذی شعور تعجب کرے گا کہ ایسے پاک نام کیوں کر رکھے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دلائل نبوت میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: 265,264/2.

سے ہے کہ جس بچے کو باپ کے خون سے عبودیت الٰہی اور ماں کے دودھ سے امن عامہ کی گھٹی ملی ہو کچھ تعجب نہ کریں کہ وہ محمود الافعال اور حمید الصفات ہو۔ اور ساری دنیا کی زبان سے محمد کہلائے ﷺ۔

جب سردار عبداللہ کا انتقال ہوا ہمارے پیارے رسول ﷺ ابھی شکم مادر ہی میں تھے۔ عبداللہ کی وفات کی خبر مکہ پہنچی تو سردار عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر کی تصدیق کے لیے مدینہ بھیجا۔ عبداللہ انتقال کر چکے تھے۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ عزیز تھے، اس لیے تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ سیدہ آمنہ نے ان کی وفات پر بڑا درد انگیز مرثیہ کہا۔

عبداللہ نے ترکہ میں پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ اُس کا نام ام ایمن تھا۔ یہ سب چیزیں اللہ کے رسول ﷺ کو ترکہ میں ملیں۔ ام ایمن کا اصل نام برکت تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو گود میں کھلایا تھا، اللہ کے رسول ﷺ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: "أُمِّي بَعْدَ أُمِّي" یعنی میری والدہ کے بعد یہ میری ماں ہیں۔ ان کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کا پہلا نکاح عبید الحبشی سے ہوا تھا، اس سے ایمن پیدا ہوا۔ دوسرا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا ان سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ اسامہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی اپنی خلافت کے ایام میں ام ایمن کی زیارت کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔[1]

---

[1] أسد الغابة: 9/291.

5

ولادت با سعادت

آپ ﷺ کی ولادت با سعادت نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی پوری مخلوقات کے لیے باعث رحمت و سعادت تھی۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب بیان کرتی ہیں: جب آپ ﷺ کی ولادت ہوئی تو میرے جسم سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محلات روشن ہو گئے۔[1] ایوان کسریٰ کے چودہ کنگورے گر گئے۔ مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بحیرہ ساوہ خشک ہو گیا اور اس کے اردگرد کے گرجے منہدم ہو گئے۔[2]

آپ ﷺ کے والد کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم تھا وہ ہاشمی اور قریشی تھے۔ کائنات کے افضل ترین قبیلہ سے تعلق تھا۔ ان کے جد امجد حضرت

---

① مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص: 12.

② مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص: 12 لیکن اس روایت میں کلام ہے۔

اسماعیل علیہ السلام بن ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے۔ پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی جناب عبداللہ وفات پا چکے تھے۔ ان کا نسب نہایت پاکیزہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس گھرانے میں کوئی بچہ نکاح کے بغیر پیدا نہیں ہوا[1]۔ عبداللہ اپنے والد عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور سب سے لاڈلے صاحبزادے تھے۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے۔

باپ کو یوں تو ساری اولاد سے محبت ہوتی ہے مگر عبدالمطلب کو عبداللہ سے غیر معمولی محبت تھی۔ جب عبداللہ کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو ان کی شادی عرب کی نہایت معزز و محترم خاتون آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے کر دی۔ یہ قریشی خاتون تھیں ان کے والد بنو زہرہ کے سردار تھے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یتیم پیدا ہوئے۔ اپنے والد کا پیار، محبت اور شفقت نہ پا سکے۔ مگر براہ راست سماوی نگرانی میں ایک بڑے کام، ایک بڑی ذمہ داری کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بچپن سے تربیت کی گئی۔ کائنات کی افضل ترین شخصیت صلی اللہ علیہ وسلم کا جمالِ جہاں تاب 9 ربیع الاول کو بمطابق پیر 20 اپریل 571ء کے دن صبح صادق کے وقت اس دنیا میں طلوع ہوا۔ واقعہ فیل کو پچاس دن گزر چکے تھے۔ ولادت شعب بنی ہاشم میں ابو طالب کے گھر ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی والدہ شفا نے دایہ کے فرائض انجام دیے۔

ولادت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے دادا کی خدمت میں پوتے کی خوشخبری بھجوائی۔ دادا عبدالمطلب خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ پوتے کو گود میں لیا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: 2/270.

خانہ کعبہ پہنچے اور دُنیا کے مسعود ترین نومولود کی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی، اس کا شکر ادا کیا۔ بڑی محبت سے ''محمد'' نام تجویز کیا۔ آپ کے اور بھی بہت سے نام ہیں جن میں ''احمد'' زیادہ مشہور ہے۔ حدیث شریف میں عاقب (سب سے پیچھے آنے والا) حاشر (جن کے قدموں پر مخلوق کوحشر میں اکٹھا کیا جائے گا) ماحی (کفر و شرک کو مٹانے والا)۔ اور دیگر نام بھی آئے ہیں۔ کنیت بڑے بیٹے کے نام پر ابو القاسم ﷺ تھی۔ سبحان اللہ! محمد ﷺ کتنا پیارا نام ہے۔ اس کے معنی ہیں: دنیا میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا۔[1] شاعر اسلام سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

وَشَقَّ لَهٗ مِنِ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٗ

''اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی عزت بڑھانے کے لیے ان کا نام اپنے نام سے نکالا، چنانچہ عرش والا ''محمود'' ہے تو پیغمبر ''محمد'' ہے۔''[2]

عربوں کے ہاں حرب، صخر، حمزہ، طلحہ جیسے نام مشہور تھے۔ مگر یہ اللہ کی قدرت اس کی شان اور اُسی کی مرضی تھی کہ نام مبارک ''محمد ﷺ'' رکھا گیا۔

اور بلاشبہ اس کائنات میں جتنی تعریف اور جتنا چرچا محمد ﷺ کے بے مثل محاسن کا ہوا ہے اتنا کسی اور بشر کا نہیں ہوا۔

---

[1] البدایة والنهایة: 2/266-267.

[2] البدایة والنهایة: 2/279، وسبل الهدی والرشاد: 1/408.

خانہ کعبہ کے سائے تلے عبدالمطلب کے لیے ایک قالین کا ٹکڑا بچھا دیا جاتا تھا جس پر احتراماً ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں بیٹھتا تھا۔ ایک دن چھوٹی سی عمر میں محمد ﷺ آئے اور آ کر قالین پر بیٹھ گئے۔ سردار عبدالمطلب کی اولاد نے اٹھانا چاہا۔ انھوں نے انکار کیا۔ دوبارہ بیٹھ گئے۔ انھوں نے پھر منع کیا، شدت اختیار کی، ادھر عبدالمطلب نے دیکھ لیا۔ اولاد کو منع کیا کہ اس مبارک بچے کو نہ اٹھاؤ۔[1] اور بے اختیار کہنے لگے:

وَالْبَيْتُ ذُو الْحُجُبِ وَالنُّصُبِ وَالشُّهُبِ

إِنَّ ابْنِي هٰذَا السَّبَبُ مِنَ السَّبَبِ

''یہ گھر پردوں والا، مرتبے اور جاہ والا ہے۔ اس کی عظمت کے اسباب میں سے ایک سبب میرا یہ بیٹا بھی ہے۔''[2]

---

① البدایۃ والنھایۃ: 294/2.

② رحمۃ للعالمین، ص: 21.

اہل عرب اپنے بچوں کو شہری کثافتوں سے دور رکھنے کے لیے دودھ پلانے والی بدوی عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے تاکہ جسم طاقتور رہے اور اعصاب مضبوط ہوں نیز بچپن ہی سے خالص اور فصیح عربی زبان سیکھ لیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کائنات میں سب سے بڑھ کر قادر الکلام تھے۔ خطاب فرماتے تو فصاحت و بلاغت کے گوہر والماس لٹا دیتے تھے۔ آپ سے بہتر کوئی خطیب نہ تھا۔ وہ بلا تردد رکے بغیر گھنٹوں لوگوں سے خطاب فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ افراد سے خطاب فرمایا۔ صحابۂ کرام کہتے ہیں کہ ہم اپنے خیموں میں تھے تمام افراد تک آپ کی آواز پہنچی اور سب نے خطبہ سماعت کیا۔

ایک مؤرخ کہتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ بالعموم دیہات میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت بھی عموماً شہروں کی بجائے دیہی علاقوں میں ہوئی۔ آزاد فضا،

شفاف ہوا، اور صاف ستھرے ماحول کا اپنا مزا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی پرورش بنوسعد میں ہوئی ۔ طائف کے قرب و جوار کا علاقہ اس لحاظ سے تاریخی علاقہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنا بچپن یہاں بسر فرمایا ہے۔حلیمہ سعدیہ بنت ابی ذؤیب بنوسعد کی کچھ عورتوں اور خاوند کے ساتھ مکہ آئیں تاکہ دودھ پلانے کے لیے بچہ حاصل کریں۔تمام عورتوں کو کوئی نہ کوئی بچہ مل گیا۔حلیمہ سے محمد کو دودھ پلانے کے لیے کہا گیا مگر انھیں ایسے امیر گھرانوں کے بچوں کی تلاش تھی جہاں سے اچھا معاوضہ مل سکے۔حلیمہ نے سوچا کہ ایک یتیم کے گھر والے کیا معاوضہ دیں گے۔یہی وجہ تھی کہ کوئی عورت اس بچہ کو گود لینے پر راضی نہ تھی۔قافلہ کے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔حلیمہ نے اپنے خاوند سے مشورہ کیا اور کہا کہ مجھے خالی ہاتھ واپس جانا اچھا نہیں لگ رہا۔کیوں نہ میں جا کر اسی یتیم بچہ کو لے آؤں؟۔شوہر نے کہا: کوئی حرج نہیں۔ممکن ہے اللہ اسی میں ہمارے لیے برکت دے دے، چنانچہ حلیمہ نے محمد ﷺ کو اپنی گود میں لے لیا۔[1]

[1] البدایۃ والنھایۃ: 286/2.

7

اماں حلیمہ سعدیہ بیان کرتی ہیں: ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ میری گدھی خستہ حال تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ قافلے میں سب سے پیچھے رہتی تھی۔ مگر اب اس کی شان ہی نرالی ہوگئی۔ اللہ کی قسم! وہی مریل گدھی جو پہلے دھیمی دھیمی چلتی تھی، اب سارے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی اور کوئی سواری اس کی برابری نہ کر سکی۔ میری سہیلیاں مجھ سے کہنے لگیں: او ابو ذویب کی بیٹی! اری یہ کیا ہوگیا؟ یہ تیری وہی گدھی تو ہے جس پر تو سوار ہو کر آئی تھی۔ کہیں سواری تو نہیں بدل گئی؟۔ قارئین کرام! اصل بات یہ تھی کہ سواری نہیں سوار بدل گیا تھا۔ اماں حلیمہ بیان کرتی ہیں ہمارے علاقے بنو سعد میں قحط سالی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اللہ کی زمین کا کوئی خطہ ہمارے علاقے سے زیادہ کنگال اور قحط زدہ ہوگا۔ مگر میری بکریاں چرنے جاتیں تو واپسی پر بہت آسودہ حال اور دودھ سے بھرپور واپس آتی تھیں۔

میرا اپنا بچہ بھوک سے اس قدر بلکتا تھا کہ ہم رات بھر سو نہ سکتے تھے۔ نہ میرے سینے میں بچہ کے لیے دودھ ہوتا تھا۔ مگر جب میں محمد کو لے کر آئی اور اسے اپنی آغوش میں رکھا تو اس نے جس قدر چاہا شکم سیر ہو کر دودھ پیا۔ اس کے رضاعی بھائی نے بھی شکم سیر ہو کر دودھ پیا، پھر دونوں سو گئے۔ میرا خاوند اونٹنی کا دودھ دوہنے گیا تو اس کے تھن بھی دودھ سے لبریز تھے۔ اس نے اتنا دودھ دیا کہ ہم دونوں نے خوب آسودہ ہو کر پیا۔ صبح ہوئی تو میرا شوہر کہنے لگا: حلیمہ! خدا کی قسم! تم نے بڑی بابرکت روح حاصل کی ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی یہی لگتا ہے۔[1]

اللہ کے رسول ﷺ کے رضاعی والد کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا۔ ان کی کنیت ابو کبشہ تھی۔ سرداران قریش اللہ کے رسول ﷺ کو بعد از رسالت مذاق اور تحقیر کے طور پر ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔[2] جب اللہ کے رسول ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کو خطوط ارسال فرمائے تو ان میں روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی خط لکھا۔ جس میں اسے اسلام لانے کی دعوت دی تھی اور نہ ماننے کی صورت میں وعید سنائی تھی۔ جب آپ ﷺ کا مکتوب گرامی اس کے پاس پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ہرقل نے اسے اپنے لیے چیلنج تصور کیا اور اپنے وزراء، امراء، پادری اور دانشور اکٹھے کیے۔ ان سے مشورہ کیا اور ابو سفیان جو تجارت کی غرض سے وہاں موجود تھا اس سے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کم و بیش دس سوالات کیے۔ ابو سفیان دربار سے نکلا تو کہنے لگا: لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي

---

① البدایۃ والنھایۃ: 286/2۔

② الإصابۃ: 165/4۔

كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ ابو کبشہ کے بیٹے کا معاملہ بڑا زور پکڑ گیا ہے۔اس سے تو بنو اصفر (رومیوں) کا بادشاہ بھی ڈرنے لگا ہے۔[1]

جب آپ ﷺ کی عمر مبارک دو سال ہوئی تو حلیمہ سعدیہ نے دودھ چھڑا دیا اور آپ ﷺ کو مکہ لے آئیں۔ والدہ ماجدہ سے ملاقات کرائی۔ جن برکات کا ظہور وہ اس بچے کے دم قدم سے دیکھ چکی تھیں ان کی بنا پر اُن کی خواہش تھی کہ بچہ کچھ مدت اور ان کے پاس رہے، چنانچہ انھوں نے سیدہ آمنہ سے درخواست کی کہ بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیں تاکہ ذرا مضبوط ہو جائے۔ مجھے اس کے بارے میں مکہ کی وبا کا خطرہ ہے۔غرض اماں حلیمہ کے اصرار پر بچے کو واپس بنو سعد میں لے جانے کی اجازت مل گئی۔ اماں حلیمہ کہتی ہیں کہ دیگر بچوں کے مقابلے میں محمد خاصے مضبوط اور توانا ہو چلے تھے۔ اس دوران آپ اپنے ایک رضاعی بھائی عبداللہ اور دو بہنوں انیسہ اور شیما (شیما کا نام حذافہ یا جذامہ تھا) کے ساتھ بکریاں چراتے رہے کہ ایک دن بڑا عظیم واقعہ رونما ہوا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو لٹایا۔ سینہ چاک کر کے دل نکالا، پھر دل سے ایک لوتھڑا نکال پھینکا اور کہا: یہ شیطان کا حصہ تھا، پھر دل کو ایک طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور جوڑ کر دوبارہ اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔ اب شیطان آپ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ دوسرے

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 7.

بچوں نے جب حلیمہ کو واقعہ بتایا وہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ آپ ﷺ کا رنگ فق تھا۔ اس واقعے کے بعد حلیمہ کو خطرہ محسوس ہوا اور انھوں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کے حوالے کر دیا۔ آپ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ ہی کے پاس رہے۔[1]

آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی اور بچپن بڑے عجیب وغریب اتفاقات میں گزرا۔ والد کی شکل تک نہ دیکھی[2] جب ذرا بڑے اور سمجھ دار ہوئے تو والدہ چل بسیں۔[3] اب دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش شروع کی۔ بڑی محبت سے پالا مگر آٹھ سال کے ہوئے تو وہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔[4] اب چچا ابو طالب نے کفالت کی ذمہ داری سنبھالی مگر جب مشکل ترین دور شروع ہوا تو وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے اُٹھ جانے کے معاً بعد دکھ اور سکھ کی ساتھی اپنی جان اور مال نچھاور کرنے والی رفیقہ حیات خدیجۃ الکبریٰ نے بھی جنت الفردوس کی راہ لی۔[5] بعض علماء کرام نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اللہ نے اپنے سوا تمام سہارے ختم کر دیے۔ صرف رب العزت کے ساتھ تعلق اور اسی کا سہارا باقی رہ گیا۔

[1] صحیح مسلم، حدیث:162، والبدایۃ والنھایۃ 2/287.

[2] مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص:18.

[3] مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص:21.

[4] أیضا، ص:21.

[5] مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب، ص:152.

8

رحمت عالم کے آنسو شفیق والدہ کے مرقد پر

مدینہ منورہ میں بنونجار بڑا مشہور اور اہم قبیلہ تھا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے والد کے ننھیال تھے۔ اب ہم ذرا پیچھے پلٹتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے پردادا ہاشم بن عبد مناف جن کی نسبت سے آپ ہاشمی کہلاتے ہیں، ایک مرتبہ تجارت کے لیے شام تشریف لے گئے۔ راستے میں مدینہ پہنچے تو وہاں بنونجار کی ایک نیک نام خاتون سلمیٰ بنت عمرو سے شادی کر لی۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرے اور بیوی کو حالت حمل میں میکے ہی میں چھوڑ کر شام روانہ ہو گئے اور فلسطین کے شہر غزہ میں انتقال کر گئے۔ ادھر سلمیٰ کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ بچے کے سر کے بالوں میں سفیدی تھی، اس لیے اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔[1] یہی بچہ آگے چل کر عبدالمطلب کے نام سے معروف ہوا۔ یہی اللہ کے رسول ﷺ کے دادا محترم تھے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو انصار کے قبائل تلواریں حمائل

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 1/137-138.

کیے اللہ کے رسول کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان میں آپ کا ننھیالی قبیلہ بنو نجار پیش پیش تھا۔ جس جگہ آج مسجد نبوی ہے یہ بنو نجار کا محلّہ تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاری کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔[1] آپ ﷺ کی والدہ آپ ﷺ کو اپنے ننھیال سے ملانے اور اپنے متوفی شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے اپنی خادمہ ام ایمن اور اپنے سرپرست عبدالمطلب کی معیت میں کوئی پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مدینہ تشریف لے گئیں۔ وہاں ایک ماہ قیام رہا۔ واپسی ہوئی تو راستے میں بیمار ہو گئیں۔ اور ابواء نامی بستی میں پہنچ کر رحلت فرما گئیں۔[2] بعد میں اللہ کے رسول ﷺ جب ابواء سے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت طلب کی۔ جو عطا کی گئی۔ آپ خود بھی روئے اور جو ساتھ تھے وہ بھی روئے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّي أَنْ أَسْتَغْفِرَ لأمّي فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي واسْتَأْذَنْتُهُ أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا فأذِنَ لِي)۔

"میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کے لیے مغفرت طلب کرنے کی اجازت مانگی تو نہ مل سکی اور اُن کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔"[3]

---

① مختصر سیرۃ الرسول، ص:229، والرحیق المختوم 241،240۔

② السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 168/1۔

③ صحیح مسلم، حدیث:976۔

آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کی وفات کے بعد بوڑھے عبدالمطلب اپنے یتیم پوتے کو لے کر مکہ واپس آئے۔ اور کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ پوتے سے بے حد محبت کرتے، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ وہ بلاشبہ اپنی قوم کے بہت بڑے سردار تھے۔

9

کائنات کی منفرد شخصیت

بعثت سے پہلے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی بڑی متواضع اور سادہ تھی۔ انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود ان کی جوانی بے داغ تھی۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں، گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں اس ماحول میں اس جداگانہ امتیازی فطرت کے حامل فردِ فرید نے کبھی شراب کا ایک قطرہ بھی اپنی زبان کے نزدیک نہیں آنے دیا۔ انھوں نے شطرنج کے مہروں کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کے والد عبداللہ اس دنیا سے درہم و دینار چھوڑ کر رخصت نہیں ہوئے۔ صرف پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ اور ایک حبشیہ لونڈی چھوڑی۔ ان کا نام برکت اور کنیت ام ایمن تھی۔ یہی ام ایمن ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو گود میں کھلایا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس کپڑوں کے زیادہ جوڑے نہ تھے۔ صرف ایک جوڑا تھا جسے دھو کر پہن لیتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کا جسم مبارک ریشم و دیباج

سے بھی زیادہ نرم و نازک تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کا شرف حاصل کیا۔ اللہ کی قسم! میں نے اللہ کے رسول کی ہتھیلی کو ریشم و دیباج سے بھی زیادہ نرم پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے نکلنے والے پسینہ کی تعریف میں حضرت انس فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے اس کی خوشبو کستوری اور عنبر سے بھی عمدہ اور بہتر پائی۔ [1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت والد کے بعد شفیق چچا ابوطالب نے کی۔ وہ بھی مالدار نہ تھے۔ بچپن میں ہر نبی کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بکریاں چرائیں۔ نہایت معمولی اجرت کے عوض عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چراتے رہے۔ اہل علم نے بکریاں چرانے کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ بکریاں چرانے سے دل میں نرمی، تواضع اور انکسار پیدا ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں کی سیاست، اور معاملات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بہترین اور پاکیزہ کمائی ہے۔ اس میں کسی قسم کا دھوکا یا فراڈ شامل نہیں۔ نہ اس میں کوئی سود کی لعنت ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو غنی کر دیا۔ سورۂ والضحیٰ میں ارشاد ہوا:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴾

”کیا اس نے آپ کو یتیم پا کر ٹھکانا نہیں دیا اور آپ کو جویائے راہ پا کر

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 3561، وصحیح مسلم، حدیث: 2330.

ہدایت نہیں دی اور آپ کو تنگدست پا کر تونگر نہیں کر دیا۔"

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آپ نے 63 سال کی زندگی گزاری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سب سے اعلیٰ، ارفع اور بہترین دلیل یہ ہے کہ آپ نے ساری زندگی ایک دفعہ بھی جھوٹ نہیں بولا۔ ساری زندگی خیانت کے کبھی مرتکب نہ ہوئے۔ کبھی فحش گوئی نہیں کی۔ زبان پر مکمل کنٹرول تھا۔ لسانِ مبارک سے کبھی کوئی غلط بات نہیں نکلی۔ نبوت سے پہلے بھی آپ کی اعلیٰ عادات اور خصائل بڑے منفرد اور بے مثل تھے۔...... زمانۂ جاہلیت کے انتہائی گمراہ ماحول میں آپ کی بے مثال پاکیزہ زندگی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس ظلمت کدہ میں چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا ہے۔

بچپن

بچپن کی خصوصیات میں ایک خصوصیت آپ کی یہ بھی تھی کہ آپ دوسرے بچوں کی طرح حریص اور طماع نہ تھے۔ آپ بچپن ہی سے قناعت پسند تھے۔ گھر کے دوسرے بچے جب صبح کو بیدار ہوتے تو شکم سیری کی وجہ سے پریشان اور آلودہ چشم نظر آتے تھے، لیکن آپ کم خوری کے باوجود نہایت مسرور، بیدار مغز اور سرمگیں چشم دکھائی دیتے تھے۔

دنیائے اخلاق میں شرم وحیا بہت قیمتی چیز ہے اور یہ اس خصلت کا نام ہے جو شرافت وانسانیت کی نظر میں معیوب چیزوں کو روکے۔ سرکار دو عالم ﷺ بچپن ہی سے شرم وحیا کے پیکر تھے روایات میں ہے کہ تعمیر کعبہ کے موقع پر جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ جو آپ سے صرف دو سال بڑے تھے، انہوں نے دیکھا کہ پتھروں سے ان کے معصوم بھتیجے محمد ﷺ کے مونڈھے

چھلے جا رہے ہیں۔ اس زمانے کے عربوں میں آج کل کے یورپ کی طرح برہنگی کوئی معیوب شے نہیں تھی۔ وہ تو خانہ کعبہ کا طواف بھی مادر زاد برہنہ ہو کر کرتے تھے۔ اس وجہ سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے پر ترس کھاتے ہوئے ارادہ کیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لنگی کھول کر ان کے مونڈھے پر رکھ دیں تا کہ پتھروں کے اٹھانے سے ان کے مونڈھے نہ چھلیں۔ لیکن اس کنواری عورتوں سے زیادہ با حیا اور شرمیلی فطرت والے بھتیجے کے لیے اتنی سی برہنگی بھی نا قابل برداشت تھی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ ابھی لنگی کھلنے نہ پائی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت غیر ہونے لگی اور ایک ایسی اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فوری طور پر لنگی جوں کی توں باندھ دی۔

ایک اور موقع پر بچے کھیل رہے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اسی کھیل میں بچے پتھر اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے جانے لگے۔ پتھر اٹھانے کے لیے انہوں نے اپنی لنگیاں کھول لیں اور برہنہ ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لنگی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ کسی غیبی شخص نے زور سے ڈانٹ کر کہا ''لنگی باندھو'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً لنگی باندھ لی اور پتھر اپنی گردن پر اٹھانے لگا''۔[1]

---

[1] ''سیرت ابن ہشام'' جلد 1 'ص:183 ''البدایہ والنہایہ'' جلد 2 'ص:450۔ وسیرت خاتم النبیین۔

11

گلہ بانی

اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ مرالظہر ان میں تھے۔ فاقہ کش صحابہ ایک جنگل میں پہنچ کر پیلو کا پھل توڑ کر کھانے لگے۔ ارشاد فرمایا: سیاہ پھل زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے تعجب سے عرض کیا: آپ کو کیسے معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا: یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے۔

ارشاد فرمایا: ہاں کوئی ایسا نبی نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔

بچپن میں جب آپ بنوسعد میں اماں حلیمہ سعدیہ کے ہاں مقیم تھے تو اس وقت اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ آپ نے بکریاں چرائیں۔

جب آپ ﷺ ذرا بڑے ہوئے تو آپ نے مکہ مکرمہ میں بکریاں چرائیں۔ چنانچہ بخاری شریف اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ کیا آپ نے بھی؟

ارشاد فرمایا: ہاں میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قراریط کے عوض چرایا کرتا

تھا۔① سیرت نگاروں نے قراریط کا جو مفہوم لکھا ہے وہ یہ ہے کہ قراریط بکریوں کے دودھ کا وہ حصہ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ ان سے اجرت کے طور پر لیا کرتے تھے جسے ابو طالب کے اہل وعیال کے ساتھ بطور غذا استعمال فرمایا کرتے۔

فتح الباری میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: میں بھی اپنے گھر والوں کی بکریاں اجیاد کے مقام پر چرایا کرتا تھا۔

انبیائے کرام کا بکریاں چرانا دنیا کی گلہ بانی کا مقدمہ اور تمہید ہوتی ہے۔ بکریاں چرانے میں گلہ بان کو ہر طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ کچھ بکریاں اس طرف دوڑتی ہیں اور کچھ دوسری طرف ان کو نظم و ضبط میں لانا بہت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ پھر ان کو بھیڑیوں اور درندوں سے بچانا بھی گلہ بان کے فرائض میں ہوتا ہے۔ انبیاء کو چونکہ امت کا گلہ بان بننا ہوتا ہے۔ اور امت کی صلاح و فلاح کی فکر میں شب و روز سرگرداں رہنا ہوتا ہے۔ امت کے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ اور انبیاء کرام ان کو ادھر ادھر بھاگنے سے روکتے ہیں۔ ان کو شریعت کے نظم و ضبط میں رکھتے ہیں۔ ان کو شیطان اور نفس کے بھیڑیوں اور اور درندوں سے بچاتے ہیں۔ اس لیے بچپن میں ان سے بکریاں چروا کر ایک ٹریننگ دی جاتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بچپن اور جوانی میں بھی بکریاں چرائیں۔ آپ نے کتنا عرصہ بکریاں چرائیں۔ کسی روایت میں اس کی تفصیل نہیں ملتی۔

---

① صحیح بخاری: 2262. وسیرت خاتم النبیین۔

12

حرب فجار کا پس منظر

بعثت نبوی سے کم و بیش بیس سال پہلے کی بات ہے، حیرہ کا بادشاہ نعمان بن منذر اپنے دربار میں بیٹھا ہوا برّاض بن قیس کنانی سے گفتگو کر رہا تھا۔ عکاظ (طائف) میں ہر سال بہت بڑا میلہ لگتا تھا جس میں نعمان بھی اپنا سامان تجارت بھجوایا کرتا تھا۔ اس نے کہا: برّاض کیا یہ ممکن ہے کہ میرا سامان بحفاظت حیرہ (عراق کا علاقہ) سے عکاظ تک پہنچ جائے؟ کون شخص ہے جو مجھے راہ داری کی ضمانت دے؟ برّاض بڑا بڑبولا اور کینہ پرور شخص تھا۔ اس نے کہا: بنو کنانہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ نعمان کہنے لگا: مجھے صرف کنانہ کی نہیں تمام قبائل کی ذمہ داری لینے والا شخص چاہیے۔

مجلس میں عرب کا ایک اور بڑا سردار عروہ بن عتبہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ عروہ کا تعلق بنو قیس سے تھا جو ہوازن کی ایک شاخ تھے۔ اس نے بادشاہ سے کہا: بادشاہ کی عمر دراز ہو، میں تمام قبائل: بنو قیس، اہل نجد اور تہامہ کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

برّاض نے بڑے غصے اور تعجب سے کہا: عروہ! کیا تم کنانہ کی بھی ذمہ داری لیتے ہو؟ اس نے کہا: صرف کنانہ کی نہیں، میں تو تمام لوگوں کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں۔ برّاض کو اس کا انداز پسند نہ آیا۔ کینہ پرور پہلے ہی تھا۔ جب عروہ وہاں سے واپسی کے لیے نکلا تو برّاض بھی تعاقب میں نکل کھڑا ہوا اور دوران سفر عروہ کو غافل پا کر قتل کرنا چاہا۔ عروہ نے معذرت کی کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اللہ کے لیے مجھے قتل نہ کرو۔ مگر برّاض نے اُس کی ایک نہ سنی اور اسے قتل کر ڈالا۔ عروہ کے قتل سے بہت بڑا فتنہ پیدا ہو گیا اور لڑائی شروع ہوگئی۔ قریش کنانہ کی شاخ تھے یہ بنوقیس کے مقابلے پر نکلے۔ قریش کی قیادت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے والد حرب بن امیہ بن عبد شمس کے ہاتھ میں تھی۔ لڑائی کے آغاز میں بنوقیس کا پلڑا بھاری تھا۔ مگر اختتام پر قریش جیت گئے۔ اس جنگ میں چونکہ حرم اور حرمت والے مہینے دونوں کی حرمت پامال کی گئی تھی، اس لیے یہ جنگ حرب فجار (نافرمانوں کی جنگ) کے نام سے موسوم ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں براہ راست شرکت تو نہیں فرمائی، بس اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتے رہے۔ سیرت نگاروں کے مطابق اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک بیس برس کے قریب تھی۔ لڑائی سے فارغ ہوئے تو سب لوگ عبداللہ بن جدعان کے گھر اکٹھے ہوئے اور اس کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اس کے گھر میں ایک ایسا تاریخ ساز معاہدہ ہوا جس کا تذکرہ سب سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں دونوں قبائل میں صلح ہوگئی۔[1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/221-224، والروض الأنف: 1/318-321، والبداية والنهاية: 2/303,304.

حرب فجار کو چار مہینے گزر چکے تھے۔ یمن کے ایک شہر ''زبید'' کا تاجر سامان تجارت لے کر مکہ آیا۔ مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے اس سے سامان خرید لیا مگر قیمت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس زبیدی نے اچانک بیت اللہ کے سامنے دہائی دی کہ مکہ شریف کے لوگو! عاص نے مجھ سے میری بیٹی بھی چھین لی ہے اور میرے مال کی قیمت دینے سے بھی انکاری ہے۔ اُس نے پہلے تو حلیف قبائل عبدالدار، مخزوم، جمح اور عدی سے مدد کی درخواست کی مگر کسی نے بھی عاص بن وائل کی مخالفت کی حامی نہ بھری بلکہ الٹا زبیدی ہی کو دھمکانے لگے۔ وہ جبل ابو قبیس پر چڑھ گیا اور بلند آواز سے کچھ اشعار پڑھے جن میں اپنی مظلومیت کی داستان بیان کی۔

اللہ کے رسول ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے دوڑ دھوپ کی، لوگوں کو

توجہ دلائی کہ اس کا حق دلایا جائے، پھر عاص بن وائل کو مجبور کیا کہ اس کی بیٹی واپس کرے۔ اس نے کہا: یہ تو میری لونڈی ہے جو میں نے زبیدی سے اس کے مال کے ساتھ خریدی ہے۔ زبیدی بولا: میں بیت اللہ کی عظمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ میری بیٹی ہے جو اس نے اغوا کی ہے۔ شرفاء مکہ نے تحقیق کے بعد اس کا مال اور بیٹی واپس کرائی۔

اس کے بعد عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک تاریخی اجتماع ہوا جس میں عہد کیا گیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا چاہے وہ مقامی باشندہ ہو یا باہر کا آدمی اس کی مدد کی جائے گی۔ اور اس کا حق دلوایا جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ بھی اس میں شریک تھے۔ اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں فضل نام کے لوگ شریک تھے۔ اس نام کی ایک اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں سب باتیں فضل، یعنی خوبی پر مشتمل تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ رسالت کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے: میں عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ لینا بھی پسند نہیں۔ اگر اب بھی مجھے اس قسم کے عہد و پیمان کے لیے بلایا جائے تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔[1]

آپ ﷺ کے اس فرمان سے واضح ہے کہ عدل وانصاف کی ہر امیر وغریب کو فراہمی اسلامی معاشرے کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔

---

[1] البدایۃ والنھایۃ: 306,305/2، والروض الأنف: 246-242/1 لیکن اس واقعے میں لڑکی کا ذکر خثعم قبیلے کے آدمی اور نبیہ بن حجاج کے درمیان ملتا ہے۔

14

صادق اور امین ﷺ کا حکیمانہ فیصلہ

نبوت سے پانچ سال پہلے کی بات ہے مکہ مکرمہ میں شدید بارشیں ہوئیں۔ بارش کی کثرت سے سیلاب آ گیا۔ پانی حرم مکی میں داخل ہوا اور خانہ کعبہ کی دیواروں کو بے حد نقصان پہنچا۔ خانہ کعبہ کسی بھی وقت منہدم ہو سکتا تھا چنانچہ قریش کے بڑے سردار جمع ہوئے کہ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے فیصلے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے زمانے سے اس کی بلندی 9 ہاتھ تھی۔ اس پر چھت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ چوروں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے اندر رکھا ہوا خزانہ چرا لیا۔ اس وجہ سے بیت اللہ پر چھت ڈالنا ضروری سمجھا گیا۔

متفقہ فیصلہ ہوا کہ اس عظیم گھر کی تعمیر کے لیے صرف حلال رقم استعمال ہو گی۔ رنڈی کی کمائی، سود کا مال اور ناحق کمایا ہوا مال ہرگز استعمال نہ ہو گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ نئے سرے سے بنیادیں کھودی جائیں، اس لیے پرانی عمارت کا

ڈھانا ضروری تھا۔ مگر کسی میں اس کے آغاز کی جرأت نہ تھی۔ بالآخر ولید بن مغیرہ مخزومی نے ہمت کی اور لمبی دعاؤں کے بعد پھاوڑا چلانا شروع کر دیا۔ لوگ اس اندیشے کا شکار تھے کہ اس پر ابھی کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی مگر کافی انتظار کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ ولید کو کچھ نہیں ہوا تو باقی لوگ بھی انہدام کے اس عمل میں شامل ہو گئے۔ تعمیر کے لیے ہر قبیلے کے ذمہ ایک حصہ لگا دیا گیا۔ ''باقُوم'' نامی ایک رومی معمار نگران تھا۔ قریش کے پاس حلال مال کم پڑ گیا، لہٰذا انھوں نے شمال کی جانب کعبہ کی لمبائی 6 ہاتھ کم کر دی اسی کو حطیم یا حجر کہتے ہیں۔ دروازہ زمین سے خاصا اونچا رکھا تا کہ جسے قریش چاہیں اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دیں۔ دیواریں جب پندرہ ہاتھ اونچی ہو گئیں تو اندر چھ ستون کھڑے کر کے چھت ڈال دی گئی۔ مگر چھت ڈالنے سے قبل جب عمارت حجر اسود تک بلند ہوئی تو ایک بڑا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ بنو ہاشم تلواریں لیے آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ حجر اسود کو صرف بنو ہاشم اس کی جگہ پر رکھیں گے۔

ادھر بنو حرب، بنو امیہ اور ان کے چچا زاد بھائی سو کے لگ بھگ افراد جمع ہو گئے۔ کہنے لگے کہ حجر اسود ہم رکھیں گے۔ بنو زہرہ اور بنو سہم میں اتفاق ہو گیا کہ حجر اسود پر ہمارا حق ہے۔ اسے ہم رکھیں گے۔ غرضیکہ سب لڑائی کے لیے تیار ہو گئے، ادھر خالد بن ولید کا چچا امیہ بن مغیرہ کہنے لگا کہ کیوں ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو؟ آؤ سب مل کر کسی کو حکم بنا لیتے ہیں، پھر خود ہی تجویز پیش کی کہ تمھارا کیا خیال ہے باب بنی شیبہ میں سے جو سب سے پہلے داخل ہو ہم اُسی کو اپنا حکم بنا لیں

جو وہ فیصلہ کرے اسے سب منظور کر لیں۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ باب بنی شیبہ سے داخل ہوتے نظر آئے۔ آپ ﷺ ابھی خلعتِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ سب بیک وقت پکارے: صادق و امین آ گیا۔ یہ محمد ﷺ ہیں، ہم ان کے فیصلہ سے راضی ہیں۔ جب وہ قریب آئے تو ان کو ساری صورت حال بتائی گئی۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک اتاری۔ زمین پر بچھائی۔ حجر اسود کو پکڑا۔ اُسے اُٹھا کر چادر کے درمیان رکھا۔ بنو ہاشم کو بلایا کہ یہ کونہ تم سنبھالو، بنو زہرہ کو دوسری طرف کا کونہ پکڑایا، بنو امیہ تیسری طرف اور بنو تمیم چوتھی طرف کا کونہ سنبھال کر کھڑے ہو گئے، پھر فرمایا: بنو کعب اور دیگر تمام دعویدار سب کے سب چادر پکڑ کر اٹھائیں۔ سب نے نہایت عزت و احترام، محبت اور عقیدت سے چادر کو اٹھایا اور کعبہ کی طرف چل دیے۔ جب حجر اسود کے مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور اسے اس کی جگہ پر ٹکا دیا۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے غصے سے تمتما رہے تھے، آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور ہاتھوں میں تلواریں چمکنے لگی تھیں اب مسکرا رہے تھے۔ ایک بڑی لڑائی اور عظیم فتنے کا سد باب ہو چکا تھا۔ ایک صادق و امین دانشور اور قائد نے نہایت عمدہ فیصلہ کر دیا۔ ایک ایسی شخصیت کا فیصلہ جس کا دامن کردار پھولوں سے بڑھ کر معطر اور شبنم سے زیادہ پاکیزہ تھا۔ جس نے کبھی چوری نہیں کی جو کبھی بھول کر بھی کسی خیانت کا مرتکب نہیں ہوا۔ [1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/224-234، وتاريخ الطبري: 2/212,213، وصحيح البخاري، حديث: 1582-1586، وفتح الباري: 3/555-560.

15

غار حراء

غار حراء بیت اللہ شریف سے کم و بیش 5 کلو میٹر دور جبل نور کی چوٹی پر واقع ہے۔ جب حاجی منیٰ کو جاتے ہیں۔ تو منی سے کچھ پہلے یہ پہاڑ ان کے بائیں ہاتھ نظر آتا ہے۔ غار کا رخ قدرتی طور پر کعبے کی سمت ہے۔ اس کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے کہ طاقتور اور تنومند نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتا ہے۔

یہ مختصر سا غار ہے جس کا طول تقریباً 3 میٹر اور عرض ڈیڑھ میٹر کے قریب ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کی عمر شریف چالیس برس کے قریب ہوگئی تو آپ وہاں تشریف لے جاتے۔ آپ کے ہمراہ پانی اور ستو ہوتے۔ بعض اوقات حضرت خدیجہ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ جاتیں اور قریب ہی کسی جگہ موجود رہتیں۔ آپ رمضان بھر اس غار میں قیام فرماتے۔ آنے جانے والے مسکینوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے۔ اور بقیہ اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے۔

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر خلوت آپ کو محبوب بنا دی گئی۔ اور آپ غار حراء میں جا کر خلوت گزیں ہوتے۔ آپ اللہ کی یاد اور غور و فکر میں مشغول رہتے۔ سیرت نگاروں نے اسے تحنث کا نام دیا ہے جس کا مفہوم اور

مطلب گوشہ نشینی، تعبد، یعنی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کے ہیں۔ بعض نے غور و فکر اور عبرت پذیری کے بھی معانی بیان کیے ہیں۔

آپ نے عبادت کے اس طریقہ کو غور و فکر اور یاد الٰہی کے لیے بہترین ذریعہ سمجھا۔ غار حراء کے اس خلوت کدہ میں آپ اس حقیقت کے متلاشی تھے جو اس سے قبل آپ کو کہیں نہ مل سکی تھی۔ اس حقیقت کے ذرائع میں آپ کی نظر کے سامنے یہ وسیع و عریض عالم تھا۔ اوپر نظر اٹھا کر دیکھتے تو صاف و شفاف نیلگوں آسمان نظر آتا۔ دن کو آفتاب اپنی کرنیں اس کائنات پر لٹاتا۔ رات کو جھلملاتے تارے اور چاند کی چاندنی صحراء پر پھیل جاتی آپ کائنات کے مشاہد اور اس کے پیچھے کارفرما قدرت نادرہ پر غور فرماتے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی قوم کے شرکیہ عقائد اور واہیات تصورات پر بالکل اطمینان نہ تھا۔ آپ کے سامنے کوئی واضح راہ اور معین طریقہ نہ تھا جس پر آپ اطمینان اور انشراح قلب کے ساتھ رواں دواں ہو سکتے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی یہ تنہائی پسندی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک آنے والے عظیم الشان کار خیر کے لیے تیار کر رہا تھا۔ آپ کو رویائے صادقہ کے ذریعے بشارات دی جاتیں۔ روایات میں ہے کہ آپ رات کو جو بھی خواب دیکھتے۔ بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی کی طرح اس کی صاف و شفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی۔[1]

---

[1] صحیح بخاری حدیث:4۔ والرحیق المختوم۔

نبی کریم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی ایام ہی میں ضماد ازدی مکہ آیا۔ یہ یمن کا باشندہ تھا اور سارے عرب میں جنتر منتر کے ذریعے علاج کے لیے مشہور تھا۔ جب اس نے سنا کہ محمد ﷺ پر جنات کا اثر ہے تو اس نے قریش سے کہا: میں محمد ﷺ کا علاج منتر سے کر سکتا ہوں۔ یہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: (محمد ﷺ!) آؤ میں تمھارا علاج کر دوں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اس کی فضول بات کا جواب دینے کی بجائے ذیل کا خطبہ پڑھنا شروع کیا:

(إنّ الحمدَ لله ، نَحْمدُهُ ونستعينه ، من يهده الله فلا مضلَّ له ومن يُضلِلْ فلا هاديَ له ، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له وأشهد أن محمدًا عبدهُ ورسولهُ)

''سب تعریف اللہ کے واسطے ہے، ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور

ہر کام میں اس کی اعانت چاہتے ہیں، اللہ جسے راہ دکھلا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہی رستہ نہ دکھائے اس کی کوئی رہبری نہیں کر سکتا۔ میری شہادت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں یہ بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کا بندہ اور رسول ہے" (أَمَّا بَعْدُ) "اس کے بعد مدعا یہ ہے۔"

ضماد نے بس اتنے ہی ارشادات سُنے تھے کہ جھوم اُٹھا اور بولا: یہی کلمات پھر سنا دیجیے۔ دو تین دفعہ اس نے یہی کلمات توجہ سے سنے اور بے اختیار بول اٹھا: میں نے بہت سے کاہن دیکھے، ساحر دیکھے اور شاعروں کو سُنا، لیکن ایسا کلام تو میں نے کسی سے کبھی سنا ہی نہیں۔ یہ کلمات تو ایک اتھاہ سمندر جیسے ہیں۔ اے محمد (ﷺ!) اللہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں اسلام پر آپ ﷺ کی بیعت کر لوں۔[1]

خالد بن سعید بن عاص بن امیہ اپنے سب بھائیوں سے پہلے مسلمان ہوئے۔ ان کے آغاز اسلام کا قصہ یوں ہے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نہایت وسیع و عریض آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور کوئی اس میں انہیں دھکیل رہا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ اس کی کمر تھامے ہوئے ہیں۔ وہ گھبرا کر نیند سے بیدار ہوئے اور بولے: واللہ! یہ خواب سچا ہے۔ یہ خواب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا۔ انہوں نے کہا: اس میں آپ کی بھلائی ہے۔ یہ حضرت محمد رسول

[1] صحیح مسلم، حدیث:868.

اللہ ﷺ موجود ہیں، ان کی اتباع کیجیے۔ ان کی اطاعت سے آپ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور اسلام آپ کو آگ میں داخل ہونے سے بچا لے گا (جبکہ آپ کا والد اس آگ میں گر رہا ہے)، پھر ان کی رسول اللہ ﷺ سے محلّہ اجیاد میں ملاقات ہوئی۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں آپ کو اللہ وحدہ لا شریک کی توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ بتوں کی پرستش ترک کر دو۔ وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، نہ ہی نفع و نقصان کے مالک ہیں، نہ وہ اپنی پوجا کرنے والوں کو پہچانتے ہیں۔'' یہ سن کر خالد رضی اللہ عنہ نے کلمۂ توحید پڑھا اور مسلمان ہوگئے۔ والد کو ان کے اسلام کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ انہیں تلاش کر کے لایا۔ سخت ڈانٹ ڈپٹ کی اور نہایت غصے سے کہا: واللہ! اب ہم تمہیں کھانا نہیں دیں گے۔ خالد نے کہا: آپ نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنے پاس سے رزق عطا فرمائے گا۔ وہ یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلے آئے۔[1]

---

[1] أسد الغابۃ: 125,124/2.

17

پہلی ہجرت

نبوت کے پانچویں سال کے وسط کی بات ہے، کافروں کے ظلم و ستم میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ جور و ستم کا سلسلہ نبوت کے چوتھے سال سے شروع ہوا تھا جو دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ مسلمانوں کے لیے مکہ مکرمہ میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ اور وہ اس اذیت ناک صورتِ حال سے نجات کی تدابیر سوچنے لگے۔ ہمسایہ ملک حبشہ کا بادشاہ اصحمہ ایک عادل حکمران تھا۔ اُس کا لقب نجاشی تھا۔ وہاں رعیت پر کوئی ظلم و ستم نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ سے اپنے ساتھیوں پر ظلم برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ظلم و ستم صرف فقراء اور مساکین ہی پر نہ تھا بلکہ کھاتے پیتے گھرانے بھی اس کی زد میں تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشورہ دیا کہ چپکے چپکے مکہ چھوڑ دو اور حبشہ چلے جاؤ تا کہ وہاں امن و سکون سے رہ سکو۔

حبشہ کی سرزمین اہل مکہ کے لیے اجنبی نہ تھی۔ قریش کے لوگ وہاں تجارت کے

لیے جایا کرتے تھے۔ جزیرہ عرب میں حبشہ ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے معروف تھا۔ امام طبری فرماتے ہیں کہ حبشہ کو ہجرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حبشہ کی سرزمین قریش کے لیے تجارت کا مرکز تھی۔ وہاں امن و امان تھا۔ ایک عادل حکمران تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب شعب ابی طالب میں مقیم تھے تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ جبکہ ابن حبان نے لکھا ہے کہ قریش سردیوں کے موسم میں تجارت کے لیے حبشہ جاتے تھے۔

چنانچہ رجب 5 ہجری میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پہلی جماعت نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اس جماعت میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ جن میں اللہ کے رسول ﷺ کے داماد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ اس قافلے کے امیر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان بن عفان اپنی بیوی رقیہ رضی اللہ عنہا سمیت ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے اور اللہ کے رسول ﷺ کو خاصے عرصے تک ان کی خیریت و عافیت کی خبر معلوم نہ ہو سکی۔ اچانک ایک دن ایک قریشی عورت نے آپ ﷺ کو بتایا کہ میں نے آپ ﷺ کے داماد کو اہل و عیال سمیت دیکھا ہے آپ ﷺ نے پوچھا: تم نے انہیں کس حالت میں دیکھا؟ اس خاتون نے بتایا: میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی کو گدھے پر سوار کیے لیے جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ ان کا حامی و ناصر ہو۔ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہم السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے

اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔

رات کے اندھیرے میں چپکے سے نکل کر کچھ پیدل اور کچھ سوار افراد کی اس جماعت نے بحر احمر کی بندرگاہ شعیبہ کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے وہاں دو تجارتی کشتیاں موجود تھیں۔ وہ روانہ ہونے ہی والی تھیں۔ نصف دینار فی کس کشتی کا کرایہ طے ہوا اور وہ انہیں اپنے دامن عافیت میں لے کر سمندر پار حبشہ چلی گئیں۔ قریش کو پتا چلا تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا مگر جب وہ ساحل سمندر تک پہنچے تو کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں، اس لیے انہیں نامراد واپس آنا پڑا۔ یہاں یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام کے فدائی ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے والا نہیں تھا لیکن حالات اس قدر دشوار ہو گئے تھے کہ مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجالانا ناممکن ہو گیا تھا۔

عالم یہ تھا کہ اس وقت حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انہوں نے کہا کہ میں یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا، وہ باز نہ آئے۔ حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کی۔ کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کیے، انہوں نے مشرکوں کے طمانچوں کی پروانہ کی۔ جہاں تک قرآن پڑھنا چاہتے تھے، پڑھ کر ہی دم لیا۔ واپس گئے تو اس حال میں تھے کہ چہرے پر زخموں کے نشان لیے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہ واقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے لیکن وہ بھی اس قدر مجبور تھے کہ بلند

آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے۔

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی مطلوب تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی چلی جاتی تھیں۔ غرض آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر سب سے پہلے گیارہ مرد حضرات اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ ان کے نام درجِ ذیل ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ: مع اپنی زوجہ محترمہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ: مع اپنی زوجہ محترمہ جن کا نام سیدہ سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا تھا۔ سیدنا ابو حذیفہ کا والد عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لیے انہیں گھر چھوڑنا پڑا۔

زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔ ہاشم کے پوتے تھے۔

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی جو عشرہ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قبیلہ بنو زہرہ سے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ننہیالی رشتہ دار تھے۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا۔ یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا وہی ہیں جو ابو سلمہ کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں۔

حضرت عثمان بن مظعون جمحی رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی ہیں۔

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ مع اپنی زوجہ۔ ان کا نام (حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا بنت ابی حشمہ تھا: سابقون اولون میں ہیں۔ بدر میں شریک تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم: ان کی ماں برہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں یہ سابقون فی الاسلام میں ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔

حضرت ابوحاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ: بدر میں شریک تھے۔ امام زہری کا بیان ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔

حضرت سہیل بن بیضاء: قریشی تھے اور بنو فہر سے تعلق تھا۔ یہ حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت دونوں میں شامل تھے۔ سن ۹ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔ سابقون اولون میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کے اس سفر میں ان کا بیٹا سائب بھی شامل تھا۔ مہاجرین میں مدینہ میں وفات پانے والے یہ سب سے پہلے شخص ہیں۔ دو ہجری میں فوت ہوئے۔

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنوامیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔ اس قافلہ

کے متعدد شرکاء، مثلاً: زبیر اور مصعب خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور ابو سبرہ معمولی لوگ نہ تھے اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم وستم صرف بے کسوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے باا ثر خاندان والے بھی ان کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر لٹایا جاتا تھا، یعنی حضرت بلال، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ ان حضرات کا نام مہاجرینِ حبشہ کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ فدایانِ حق لذتِ درد میں ایسے گُم تھے کہ اُنھیں لُطفِ ستم چھوڑنا بھی گوارا نہیں تھا۔

پہلی ہجرت حبشہ کو کم وبیش تین ماہ گزر چکے تھے کہ مکہ مکرمہ کے حالات میں خاصی تبدیلی واقع ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ کے چچا اور رضاعی بھائی حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو خاصی تقویت ملی اور پھر چند دنوں بعد ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ ان دونوں کا اسلام لانا مسلمانوں کے لیے عزت اور وقار کا سبب بنا۔ پہلے مسلمان دارارقم میں چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ مگر اب پہلی بار سرِ عام کعبہ کے نزدیک نماز ادا کی جانے لگی۔ مشرکین کے ظلم وستم جاری تھے مگر وقتی طور پر ان میں کمی آ گئی۔ اب مزاحمت کرنے والے بھی آ گئے تھے۔ اسی دوران رمضان شریف میں یہ واقعہ پیش آیا: نبی کریم ﷺ ایک بار حرم تشریف لے گئے۔ وہاں قریش کا

بہت بڑا مجمع تھا۔ ان کے سردار اور بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ آپ نے اچانک کھڑے ہو کر سورۂ نجم کی تلاوت شروع کر دی۔ ان کفار نے اس سے پہلے عموماً قرآن سنا نہ تھا کیونکہ ان کا دائمی وتیرہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا:

﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ (فصلت: 26)

''اس قرآن کو مت سنو اور اس میں خلل ڈالو (اودھم مچاؤ) تاکہ تم غالب رہو۔''

لیکن جب نبی ﷺ نے اچانک سورۂ نجم کی تلاوت کی اور ان کے کانوں میں ایک ناقابل بیان رعنائی و دلکشی اور عظمت والے کلام الٰہی کی آواز پڑی تو انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔ سب کے سب بے اختیار گوش برآواز ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے سورہ کے آخر میں دل ہلا دینے والی آیات تلاوت فرما کر اللہ کا درج ذیل حکم سنایا اور سجدہ کیا تو سب کے سب بے قابو ہو کر سجدے میں گر گئے:

﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا﴾

''اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔''[1]

اس واقعے کی اطلاع جب مکہ کے دوسرے مشرکین کو ہوئی تو انہوں نے ان پر ہر طرف سے عتاب اور ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اب ان لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے رسول اللہ ﷺ پر یہ جھوٹ گھڑا کہ آپ ﷺ نے تو ان کے بتوں کا ذکر عزت و احترام سے کرتے

---

[1] صحیح البخاري: 1070,1067، و صحیح مسلم: 576، سنن أبي داود: 1406.

ہوئے یہ کہا تھا:

(تِلْكَ الْغَرَانیقُ العُلیٰ وإن شفاعَتهُنَّ لَتُرْجی)

''یہ بلند پایہ دیویاں ہیں۔اوران کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

حالانکہ یہ صریح جھوٹ تھا اور محض اس لیے گھڑ لیا گیا تھا تاکہ نبی ﷺ کے ساتھ ہی سجدے میں گر جانے کی جو ''غلطی'' ہوگئی ہے اس کے لیے ایک ''معقول'' عذر پیش کیا جاسکے۔ظاہر ہے کہ جولوگ نبی پر ہمیشہ جھوٹ گھڑتے اور آپ ﷺ کے خلاف ہمیشہ دسیسہ کاری اور افترا پردازی کرتے رہتے تھے، وہ اپنا دامن بچانے کے لیے اس طرح کا جھوٹ کیوں نہ گھڑتے۔

بہر حال مشرکین کے سجدہ کرنے کے اس واقعے کی خبر حبشہ کے مہاجرین تک بھی پہنچی لیکن انہیں اس کا اصل پس منظر معلوم نہ ہوسکا۔وہ یہ سمجھے کہ قریش مسلمان ہو گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے ماہ شوال میں مکہ واپسی کی راہ لی لیکن جب اتنے قریب آ گئے کہ مکہ ایک دن سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا تو اصل حقیقت حال آشکارا ہوئی۔اس کے بعد کچھ لوگ تو وہیں سے حبشہ پلٹ گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا قریش کے کسی آدمی کی پناہ لے کر مکے میں داخل ہوئے۔

مسلمانوں میں سے جو حبشہ سے واپس ہوئے ان پر خصوصاً اور دیگر مسلمانوں پر عموماً قریش کا ظلم وستم پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ان کے خاندان والوں نے انہیں بہت تنگ کیا۔اس کا سبب یہ تھا کہ قریش کو حبشہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کی جو خبر ملی تھی وہ اس پر خار کھائے بیٹھے تھے۔جب یہ مظالم حد سے بڑھ گئے تو اللہ کے

رسول ﷺ نے مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک بڑا قافلہ جس میں بیاسی مرد اور اٹھارہ عورتیں شامل تھیں حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ اسے دوسری ہجرت حبشہ کہا جاتا ہے۔

یہ دوسری ہجرت پہلی ہجرت کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکلات سے اٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ اب کی بار قریش پہلے سے چوکنے تھے اور ایسی ہر کوشش ناکام بنانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔ لیکن مسلمان ان سے کہیں زیادہ مستعد ثابت ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے سفر آسان بنا دیا، چنانچہ وہ قریش کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شاہ حبشہ کے پاس پہنچ گئے۔[1]

① زاد المعاد: 1/24، و مختصر السیرۃ للشیخ عبد اللہ: 125.

18

نجاشی کی بدولت مسلمان حبشہ میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش مسلمانوں کے آرام و راحت کی خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو۔ اس سفارت کی کامیابی کے لیے زبردست تیاریاں کی گئیں۔ نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے بہت قیمتی تحائف مہیا کیے گئے اور پورے سروسامان سے یہ سفارت حبشہ کو روانہ ہوئی۔ سیرت نگاروں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ مکہ کا سب سے بہترین تحفہ چمڑا تھا جو نجاشی کو بڑا پسند تھا۔ کفار مکہ نے بڑی مقدار میں چمڑا اکٹھا کیا۔ سفارت کے لیے عرب کے ذہین ترین فرزند عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو چنا گیا۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے۔ ان کی خدمت میں تحائف پیش کیے اور کہا کہ ہمارے شہر میں

چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے انہیں نکال دیا تو وہ آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے بارے میں درخواست پیش کریں گے آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے۔ نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔ درباریوں نے تائید کی۔

لیکن نجاشی نے سوچا کہ اس قضیے کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سننا اور جاننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ مسلمان یہ تہیہ کر کے اس کے دربار میں آئے کہ ہم سچ ہی بولیں گے۔ نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے۔ جب مسلمان آ گئے تو نجاشی نے پوچھا: یہ کون سا دین ہے جس کی بنیاد پر تم نے اپنی قوم سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ہے اور میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے؟ مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کو مقرر کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سوالوں کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے:

اے بادشاہ! ہم ایسی قوم تھے جو جاہلیت میں مبتلا تھی۔ ہم بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے۔ قرابت داروں سے تعلق توڑتے تھے۔ ہمسایوں سے بدسلوکی کرتے تھے۔ ہمارا ہر طاقتور آدمی کمزور کو کھا رہا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے کرم فرمایا۔ ہم ہی میں سے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا۔ اس

کی عالی نسبی، سچائی، امانت اور پاک دامنی ہمیں پہلے ہی سے خوب معلوم تھی۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں۔ اسی کی عبادت کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے تھے انہیں چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، قرابت جوڑنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے اور حرام کاری وخونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ فواحش میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورت پر جھوٹی تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس نے ہمیں نماز، روزہ اور زکاۃ کا حکم دیا......۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اسی طرح روشنی ڈالتے ہوئے کہا: ہم نے اس پیغمبر کو سچا مانا، اس پر ایمان لائے۔ اور اس کے لائے ہوئے دین کی پیروی کی۔ ہم نے ایک اللہ کی عبادت کی۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔ اس پیغمبر نے جن باتوں کو حرام بتایا انہیں حرام مانا۔ جن کو حلال بتایا انہیں حلال جانا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی۔ اس نے ہم پر ظلم وستم کیا۔ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے فتنے کھڑے کر دیے، ہمیں سخت سزاؤں سے دوچار کیا تا کہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بُت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور جن گندی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے، انہیں پھر سے حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر شدید مظالم ڈھائے، ہم پر زمین تنگ کردی۔ جب وہ ہم لوگوں اور ہمارے

دین کے درمیان روک بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے ہجرت کی اور آپ کے ملک کی راہ لی۔ دوسروں پر آپ کو ترجیح دی۔ آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا۔ ہمیں پوری اُمید تھی کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

نجاشی نے پوچھا: وہ پیغمبر جو کچھ لائے ہیں کیا وہ تمہارے پاس ہے؟

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں!

نجاشی نے کہا: ذرا مجھے بھی سناؤ۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے پرسوز آواز میں سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ نجاشی اللہ کا مقدس کلام سُن کر اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ نجاشی کے درباری بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ان کے صحیفے تر ہو گئے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ کلام جو عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے دونوں ایک ہی شمع دان کی کرنیں ہیں۔ اس کے بعد نجاشی نے عَمرو بن عاص اور عبد اللہ بن ربیعہ کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ تم دونوں چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ نہ یہاں ان کے خلاف کوئی چال چلی جا سکتی ہے۔

اس کے حکم پر وہ دونوں وہاں سے نکل گئے۔ لیکن پھر عَمرو بن عاص نے عبد اللہ بن ربیعہ سے کہا: اللہ کی قسم! کل ان کے بارے میں ایسی بات لاؤں گا کہ ان کی ہریالی کی جڑ کاٹ کر رکھ دوں گا۔ عبد اللہ بن ربیعہ نے کہا: نہیں ایسا نہ کرنا۔ ان لوگوں نے اگرچہ ہمارے دین سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ہیں تو بہر حال اپنے ہی

لوگ ۔ مگر عمر و بن عاص نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی رائے پر اصرار کیا۔

اگلا دن آیا تو عمر و بن عاص نے نجاشی سے کہا: اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں ایک بُری بات کہتے ہیں۔ اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمان کیا کہتے ہیں۔ اس دفعہ مسلمانوں کو گھبراہٹ ہوئی۔ لیکن انہوں نے طے کیا کہ ہم بہر حال سچ ہی بولیں گے، چنانچہ جب مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور اس نے ان کے سامنے اپنا سوال رکھا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاک دامن حضرت مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا تھا۔

اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور بولا: اللہ کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی بڑھ کر نہ تھے۔ اس پر نجاشی کے درباری علماء نے ''ہونہہ'' کی آواز لگائی۔ نجاشی نے کہا: ہاں! چاہے تم لوگ ''ہونہہ'' ہی کہو۔

اسکے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا: جاؤ! تم لوگ میری مملکت میں محفوظ و مامون ہو۔ جو تمہیں گالی دے گا اس پر تاوان عائد کیا جائے گا۔ مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے کسی آدمی کو ستاؤں۔ تمہیں ستانے کے بدلے سونے کا پہاڑ بھی دیا جائے تو

مجھے قبول نہیں۔

اس کے بعد نجاشی نے اپنے حاشیہ نشینوں کو حکم دیا: ان دونوں کو ان کے ہدیے واپس کر دو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔[1] ...... یوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سُرخرو فرمایا۔ اور کفار مکہ کے سفیر خائب و خاسر ہو کر واپس چلے آئے۔

[1] مسند أحمد بن حنبل: 202/1، و مستدرک الحاکم: 310/2، و السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 370/1.

19

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ قبیلہ غفار کے ایک فرد تھے۔ انھیں خبر پہنچی کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبریں آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے بھائی سے کہا: ''اس شخص کے پاس جاؤ، اس سے گفتگو کرو اور پھر مجھے اس کی خبر دو۔'' وہ روانہ ہوئے۔ مکہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، پھر اپنے بھائی ابو ذر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ ابو ذر نے پوچھا: ''کیا خبر لائے؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ وہ خیر اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔ برائی سے روکتا ہے۔ اس کا کلام حقیقت پر مبنی ہے۔ شعر و شاعری نہیں ہے۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے اپنی خبر سے میری تشفی نہیں کی۔ انھوں نے دامن جھاڑا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنا تھیلا، پانی کا مشکیزہ، توشہ اور عصا سنبھالا اور مکہ آن پہنچے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہیں تھے۔ اور کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ زمزم کا پانی پیتے

رہے اور مسجد ہی میں ٹھہر گئے۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ شخص مسافر معلوم ہوتا ہے، دریافت کیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی: ''ہاں، میں مسافر ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: تو آؤ گھر چلو۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل دیے۔ دونوں چپ چاپ رواں دواں تھے۔ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کچھ پوچھا نہ انھوں نے انہوں نے کچھ بتلایا۔ صبح ہوئی تو وہ پھر مسجد آ گئے تاکہ کسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتا پتا معلوم کریں لیکن کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ بتاتا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر وہاں سے گزرے اور انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ صبح ہوئی تو وہ پھر مسجد آ گئے اور مسجد ہی میں قیام فرما رہے یہاں تک کہ رات ہو گئی، حسب معمول حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر ان کے پاس سے گزرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تمھیں ابھی تک اپنی منزل معلوم نہیں ہوئی؟ انھوں نے کہا: ''ابھی معلوم نہیں ہوسکی'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے ساتھ چلو۔'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تم اس شہر میں کس غرض سے آئے ہو؟'' وہ بولے: ''اگر تم ظاہر نہ کرو تو بتاؤں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمھاری بات کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ یہاں ایک شخص ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ پہلے میں نے اپنے بھائی کو بھیجا تھا کہ اس سے گفتگو کرے۔ وہ واپس آیا لیکن اس کی خبر سے مجھے تسلی نہیں ہوئی، لہٰذا اب میں خود ہی اس شخص سے ملنے آیا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: ''تم صحیح شخص کے پاس پہنچ گئے ہو۔ میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں، تم بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ جہاں میں جاؤں تم بھی وہیں داخل ہو جانا۔ اگر مجھے کسی شخص سے کسی قسم کا اندیشہ ہوگا تو میں دیوار کے قریب رک جاؤں گا اور ظاہر یہ کروں گا کہ میں اپنی جوتی ٹھیک کر رہا ہوں مگر تم برابر چلتے رہنا۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل پڑے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینِ حنیف کی وضاحت فرمائی تو انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ شفقت فرمایا: ''ابو ذر! ابھی اس بات کو خفیہ رکھو۔ اپنے شہر لوٹ جاؤ۔ جب ہمارے غلبہ کی خبر ملے تو ہمارے پاس آ جانا۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! میں ان لوگوں کے سامنے اعلانِ حق کروں گا۔'' پھر وہ مسجد گئے، وہاں قریش موجود تھے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے قریش کی جماعت! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود و حاکم نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔'' کفار میں غصے اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کہا: اس بے دین کی خبر لو۔ لوگ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو مارنے لگے۔ اتنا مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئے۔ اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ آ پہنچے۔ وہ ابو ذر رضی اللہ عنہ پر جھک گئے، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''نادانو! تمھاری خرابی ہو، تم غفار کے آدمی کو قتل کر رہے ہو؟

ان کا شہر تمہاری تجارتی منڈی کے گزرگاہ ہے۔ اسے مار کر وہاں سے کیسے گزرو گے؟ یہ سن کر لوگ ان کے پاس سے ہٹ گئے۔ دوسرے دن صبح طلوع ہوئی تو انھوں نے حمایت حق میں پھر وہی کلمے دہرائے، لوگوں نے پھر کہا: اس کی خبر لو، انھوں نے پھر اسی طرح اُن کی پٹائی کی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر آئے۔ ان پر جھک گئے اور وہی بات جتلائی جو پہلے دن کہی تھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے اور اپنی قوم سے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔[1]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ابوذر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ اور بھائی انیس کے ساتھ پھر مکہ روانہ ہوئے۔ مکہ کے سامنے پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ انیس نے کہا: مجھے مکہ میں کچھ کام ہے میں مکہ جاتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو، ابوذر رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہر گئے۔ انیس گئے۔ خاصی دیر کے بعد آئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اتنی دیر کیوں لگائی؟ وہ کہنے لگے: ''میں مکہ میں ایک شخص سے ملا۔ وہ تمھارے دین پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اسے بھیجا ہے۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''لوگ اسے کیا کہتے ہیں؟'' انیس نے کہا: ''لوگ اسے شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں۔'' انیس خود بھی شاعر تھے۔ کہنے لگے: میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سن رکھی ہیں لیکن جو کلام یہ شخص پڑھتا ہے وہ کاہنوں کا کلام نہیں۔ میں نے اس کے کلام کا موازنہ شاعروں کے کلام سے بھی کیا لیکن کسی شخص کی زبان پر ایسے مؤثر اور موزوں شعر نہیں آ سکتے۔ اللہ کی قسم! وہ سچا ہے اور اس کے مخالف لوگ جھوٹے ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اب تم یہیں رہو، میں اسے جا کر دیکھتا ہوں،۔ وہ مکہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3861,3522.

آئے۔ ایک ناتواں شخص کو منتخب کیا۔ اس سے پوچھا: ''وہ شخص کہاں ہے جسے تم صابی کہتے ہو؟'' اس فتنہ پرور ناتواں شخص نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بات سنتے ہی شور مچادیا اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ صابی آ گیا ہے۔ یہ سن کر سارے وادی والے ڈھیلے اور ہڈیاں لے کر ان پر پل پڑے۔ اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو پھر کھڑے ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خون آلود ہونے کی وجہ سے وہ ایک لال بت معلوم ہو رہے ہیں۔ فوراً زمزم کے پاس گئے۔ خون دھویا۔ پانی پیا، پھر تیس دن وہاں ٹھہرے، زمزم کے علاوہ ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن محض زمزم کا پانی پی پی کر ہی وہ موٹے تازے اور شگفتہ و شاداب ہو گئے اور فاقوں کے باوجود ناتوانی کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ چاندنی رات تھی۔ مکہ والے سو رہے تھے۔ اس وقت بیت اللہ خالی تھا۔ کوئی شخص طواف نہیں کر رہا تھا۔ صرف دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ اساف اور نائلہ نامی بتوں کو پکار رہی تھیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ اساف کا نکاح نائلہ سے کر دو۔ وہ پھر بھی باز نہیں آئیں، بتوں کو پکارتی رہیں۔ جب وہ دوبارہ ان کے پاس سے گزریں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر ان بتوں کو برا بھلا کہا۔ دونوں عورتیں بہت چلائیں اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئیں۔ وہ کہہ رہی تھیں: کاش! اس وقت کوئی ہمارا آدمی ہوتا۔ راستے میں ان عورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے۔ وہ پہاڑ سے اتر رہے تھے۔ انھوں نے ان عورتوں سے پوچھا: کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا: اُدھر ایک صابی آیا ہوا ہے۔ کعبہ کے پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔ انھوں نے پوچھا: ''وہ کیا کہتا ہے؟'' عورتوں

نے کہا: وہ فحش بات کہتا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ (مسجد میں) تشریف لائے۔ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے طواف کیا اور نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا:

(اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ)

آپ ﷺ نے فرمایا: (وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ).

آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم کون ہو؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غفار کا ایک شخص ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اٹھایا اور اپنی مبارک انگلیاں اپنی پیشانی پر رکھیں۔

ابوذر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ غفار کہنا آپ ﷺ کو ناگوار گزرا ہے۔ وہ آپ ﷺ کا ہاتھ تھامنے کے لیے آگے بڑھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا حال حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ جانتے تھے، اس لیے انھوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو روکا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے سر اٹھایا اور پوچھا: ''تم کب یہاں آئے؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تیس دن ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تمھیں کھانا کون کھلاتا ہے؟''

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: زمزم کے پانی کے علاوہ مجھے کھانے پینے کو اور کچھ نہیں ملا۔ میں اسی سے موٹا ہو گیا ہوں۔ بھوک یا ناتوانی بھی معلوم نہیں ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمزم کا پانی برکت والا ہے۔ یہ کھانے کی طرح پیٹ بھر دیتا ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''آج مجھے انھیں کھانا کھلانے کی اجازت دیجیے۔'' پھر وہ چلے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اطمینان سے بٹھایا۔ پھر انھیں طائف کی کشمش نکال نکال کر کھلانے لگے۔ یہ پہلا کھانا تھا جو انھوں نے مکہ میں کھایا، وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے ایک کھجور والی زمین دکھائی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یثرب کے علاوہ کوئی اور جگہ نہیں ہے، لہٰذا تم ابھی چلے جاؤ اور اپنی قوم میں تبلیغ کرو، ممکن ہے اللہ تمھارے ذریعے سے انھیں نفع پہنچائے اور تمھیں ثواب عطا فرمائے۔'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ وہاں سے رخصت ہوگئے۔ انیس کے پاس آئے۔ انیس نے پوچھا: تم نے کیا کیا؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں مسلمان ہوگیا ہوں اور ان کی نبوت کی تصدیق کرتا ہوں۔'' انیس نے کہا: ''تمھارے دین سے مجھے بھی نفرت نہیں ہے۔ میں بھی اسلام قبول کرتا ہوں۔'' پھر وہ دونوں اپنی والدہ کے پاس گئے۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اب انھوں نے اونٹوں پر اپنا سامان لادا اور اپنی قوم غفار میں پہنچے۔ ان کی تبلیغ ودعوت سے آدھی قوم مسلمان ہوگئی۔ باقی آدھی قوم نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو باقی قوم بھی مسلمان ہوگئی۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2474،2473.

20

انہی دنوں ابوجہل نے محمد رسول اللہ ﷺ کو صفا پہاڑی کے پاس آڑے ہاتھوں لیا، اذیت پہنچائی، سب وشتم کیا اور اسلام کے بارے میں نہایت ناگوار باتیں کہیں۔ یہ سارا ماجرا کسی نے عم رسول اکرم حمزہ بن عبد المطلب کو جا سُنایا۔ جناب حمزہ کو بڑا طیش آیا۔ وہ فوراً ابوجہل کی طرف گئے، اس کے پاس پہنچ کر اس کے سر پر اتنے زور سے کمان ماری کہ وہ شدید زخمی ہو گیا۔ چند مخزومی ابوجہل کی مدد کے لیے آئے اور سیدنا حمزہ سے کہنے لگے: جناب حمزہ! معلوم ہوتا ہے کہ آپ صابی اور بے دین ہو چکے ہیں۔ حمزہ نے کہا: مجھے مسلمان ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ اب ایسے حقائق واضح ہو چکے ہیں جن کی روشنی میں (علانیہ) شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور ان کا فرمان حق ہے۔ واللہ! میں اس سے ہرگز پیچھے نہ ہٹوں گا۔ اگر تم میں ہمت ہو تو مجھے روک کر دکھاؤ۔ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: چلو چھوڑو، میں نے بھی اس کے برادر زادے کو نہایت بری

طرح سب و شتم کیا ہے۔ جب حمزہ مسلمان ہو گئے تو قریش سمجھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضبوط اور محفوظ ہو گئے ہیں۔ بقول ابن اسحاق، پھر حمزہ رضی اللہ عنہ گھر واپس آئے تو شیطان نے وسوسے ڈالنے شروع کر دیے، آپ قریش کے رئیس ہیں، آبائی دین چھوڑ کر (معاذ اللہ) اس بے دین کے پیچھے لگ گئے، اس سے تو موت بہتر ہے، چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں کہا: میں کیا کر چکا ہوں۔ الٰہی! اگر یہ دین اچھا ہے تو میرے دل میں اس کی سچائی کا یقین پیدا فرما ورنہ مجھے اس حیرت سے نجات کا ذریعہ بتا، رات بھر اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا ابن اخی! اے بھتیجے! میں ایک مخمصے اور الجھن میں پھنس گیا ہوں، اس سے خلاصی نہیں پا رہا، مجھ جیسے دانشور کا ششدر ہونا اور پریشان رہنا کہ آیا اسلام رشد و ہدایت ہے یا گمراہی ہے، نہایت اذیت ناک بات ہے۔ مجھے اپنی دعوت وضاحت سے سمجھائیے، میں آپ کی بات سمجھنے کا بہت مشتاق ہوں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں وعظ و نصیحت فرمائی، دوزخ سے خوف دلایا اور جنت کی خوشخبری سنائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعظ و نصیحت کے باعث اللہ تعالیٰ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دی تو انھوں نے کہا: میں تہ دل سے گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں آپ کے دین کی علانیہ اور کھل کر تبلیغ کروں گا۔ مجھے ساری کائنات بھی دے دی جائے، تب بھی مجھے اپنا پہلا دین پسند نہیں، چنانچہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان افراد میں ہوا جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دین کو مضبوط و مستحکم فرمایا۔ [1]

---

[1] البدایة والنهایة: 39/3، ودلائل النبوة للبیهقي: 2/213،214.

21

......اور ابو جہل بھاگ نکلا

سیرت کا قاری چشم تصور سے پندرہ صدیاں پہلے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف کو دیکھ رہا ہے جہاں قریش مکہ کی ایک ٹولی ابو جہل کے ارد گرد بیٹھی ہوئی ہے۔ سامنے ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مقدس گھر ہے۔ اسلام بتدریج پھیلتا جا رہا ہے۔ کافروں کی ساری کوششیں اور توانائیاں اس دعوت حق کو روکنے میں لگی ہوئی ہیں مگر حق کی آواز مسلسل گونج رہی ہے اور بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ ابو جہل جو امت مسلمہ کا فرعون ہے، اس کا سب سے من بھاتا موضوع یہ ہے کہ مسلمانوں کو تکلیف و اذیت کیسے پہنچائی جائے۔ اچانک اس نے پہلو بدلا، اس کے چہرے سے حسد، حقد اور عناد صاف ظاہر تھا اس نے راز داری سے کہا: اے قریش! آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کی عیب چینی، ہمارے آباء و اجداد کی بدگوئی، ہماری عقلوں کی تنقیص اور ہمارے معبودوں کی تذلیل سے باز نہیں

آ رہا، اس لیے میں اللہ سے یہ عہد کر رہا ہوں کہ میں ایک بہت بھاری اور مشکل سے اٹھایا جانے والا پتھر لاؤں گا اور جب یہ سجدہ کرے گا تو اس بھاری پتھر سے اس کا سر کچل کر رکھ دوں گا۔ اب اس کے بعد تمھاری مرضی ہے کہ تم میری تایید کرو یا نہ کرو، مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دو یا میری حمایت میں اٹھ کھڑے ہو۔ بنو عبد مناف میرے ساتھ جو جی چاہے کریں اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے یہ کام ہر حال میں کرنا ہے۔ حد ہو گئی ہے۔ اب اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے مکروہ اور فاسد عزائم ان کے دلوں کے بھی ترجمان تھے۔ انھوں نے تایید میں اپنے سر ہلائے اور کہا: ابوالحکم! بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم تمھیں بنو عبد مناف کے سپرد کریں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ابوجہل نے ایک بہت بڑا پتھر اٹھا لیا اور بیت اللہ میں محمد ﷺ کا انتظار کرنے لگا۔ پتھروں کے پجاری صحن حرم میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ بے چینی سے منتظر تھے کہ ابھی ایک بڑا اقدام ہونے والا ہے۔ ابوجہل اپنی بات کا بڑا پکا ہے وہ ضرور اپنے منصوبے پر عمل کرے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ وہ روزانہ بیت اللہ تشریف لاتے، بیت المقدس کی طرف منہ کرتے اور نماز پڑھتے تھے۔ درمیان میں ان کے جدِ امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا کعبہ ہوتا جس کی تولیت صدیوں سے ان کے خاندان کے سپرد تھی۔ آج بھی آپ ﷺ حسبِ معمول تشریف لائے۔ چہرے کا رخ بیت المقدس کی طرف کر لیا، نماز کے لیے کھڑے ہوئے، قیام کیا، پھر رکوع میں چلے گئے۔ اب

اپنے رب کے حضور سجدہ کر رہے ہیں جو ہر مشکل اور پریشانی میں ان کا حامی و ناصر ہے۔ ادھر وہ سجدے میں جاتے ہیں، ادھر ابو جہل اپنے ناپاک ارادے پر عمل کے لیے اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ بھاری پتھر اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔ بہت سی نگاہیں ابو جہل کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اب وہ آگے بڑھا اللہ کے رسول ﷺ کے قریب ہوا۔ پتھر مارنے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے...... ارے! یہ کیا؟ ...... پتھر اس کے ناپاک ہاتھوں سے گر پڑا۔ اب وہ تھر تھر کانپنے لگا، چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ شکست خوردہ حالت میں پیچھے ہٹا اور بھاگ نکلا۔ قبیلے کے وہ لوگ جو تماشا دیکھنے کے لیے وقت سے پہلے ہی جمع ہو گئے تھے، نہایت تعجب سے ابو جہل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ان میں سے ایک شخص نے بے ساختہ پوچھا: ''مَا لَكَ يَا أَبَا الْحَكَمِ'' ارے ابوالحکم! تمھیں کیا ہو گیا......؟ اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور جسم بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے زبان نے اس کا ساتھ دیا۔ اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا: کل جس منصوبے کا میں نے اعلان کیا تھا اس پر عمل درآمد کے لیے میں محمد (ﷺ) کی طرف بڑھا، جب میں ان کے قریب ہوا تو میں نے اپنے اور ان کے درمیان آگ کے شعلے اگلتی خندق دیکھی، بہت سی خوفناک چیزیں اور پر مجھے نظر آئے۔ میں خوفزدہ ہو کر پیچھے کو بھاگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: وہ اللہ کے فرشتے تھے۔ اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2797، ودلائل النبوۃ للبیہقي: 189/2۔

22

عمر بن خطاب فاروق اعظم کس طرح بنے؟

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسلام لائے دو دن گزرے تھے۔ یہ بدھ کا دن، نبوت کا چھٹا سال اور ذوالحجہ کا مہینہ تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں اپنے مبارک ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا: ''اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے جو شخص تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت عطا فرما۔''...... اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پسند فرمایا اور اگلے دن، یعنی جمعرات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ سیرت نگاروں نے ان کے اسلام لانے کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ اور مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصی زندگی کے حوالے سے چند باتیں بتا دی جائیں۔ ان کا تعلق بنو عدی سے تھا۔ وہ آل اسماعیل میں سے ہیں اور ان کا نسب اوپر جا

کر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے۔ یہ بڑے تنومند تھے اور لمبے قد کے مالک تھے۔ جسم نہایت طاقتور تھا۔ اپنی تندمزاجی اور سخت خوئی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ طویل عرصے تک مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں طرح طرح کی سختیاں جھیلی تھیں۔ ان کے خاندان کی ایک لونڈی مسلمان ہوگئی۔ اسے اس قدر مارتے تھے کہ مارتے مارتے خود تھک جاتے تھے۔ اس کے بعد کہتے تھے: میں نے تجھے کسی مروت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض تھک جانے کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ ایک طرف اپنے آباء واجداد کی ایجاد کردہ رسموں کا بڑا احترام کرتے تھے اور دوسری طرف ایمان اور عقیدے کی راہ میں مسلمانوں کی پختگی اور مصائب جھیلنے کے سلسلے میں ان کی قوت برداشت کو خوشگوار حیرت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مدت تک اسلام اور اس کی واضح تعلیمات کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کے دل میں سب سے پہلے اسلام کا بیج کب بویا گیا؟ اس بارے میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہیں رات گھر سے باہر بسر کرنا پڑی۔ وہ حرم پہنچے اور خانہ کعبہ کے پردوں میں گھس گئے۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ زبانِ مبارک پر سورۂ حاقہ کی آیات کی تلاوت جاری تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کان اس خوبصورت آواز اور حکمت بھرے کلام پر لگا دیے۔ واہ! کیا خوبصورت کلام ہے، اس کا ربط کتنا شاندار ہے اور اس کے الفاظ کتنے پاکیزہ اور روح پرور ہیں۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ مگر دل ہی دل میں کہنے لگے: یہ تو واقعی شاعر ہے۔ قریش ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ اسی دوران

اللہ کے رسول ﷺ نے آیت نمبر 40، 41 کی تلاوت فرمائی:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴾

''یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔''

اب دل میں خیال گزرا کہ اس نے تو میرے دل کی بات جان لی ہے۔ یقیناً یہ کاہن ہے۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے سورۂ حاقہ کی اگلی آیات کی تلاوت فرمائی:

﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

''یہ کسی کاہن کا بھی قول نہیں ہے۔ تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ تو اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا کلام ہے۔''

یہ آیات سن کر اسلام ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔

ایک اور واقعہ بخاری شریف کی حدیث: 3866 میں موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ میں بتوں کے قریب سو رہا تھا۔ ایک شخص ایک بچھڑا لایا۔ بت پر اسے ذبح کر دیا۔ اس کے حلق سے اس قدر زور کی آواز نکلی کہ میں نے ایسی شدید چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

(یا جَلِیحْ ، أمْرٌ نَجِیحْ ، رَجُلٌ فَصِیحْ یقولُ: لا إله إلا الله)

''اے کھلے دشمن! ایک بات بتلاتا ہوں جس سے تجھے تیری مراد مل جائے۔ ایک فصیح وخوش بیان شخص یوں کہتا ہے: لَا إلٰهَ إلا الله۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں'' یہ سنتے ہی تمام لوگ (جو وہاں موجود تھے) چونک پڑے اور وہاں سے چل دیے۔ میں نے کہا: میں تو نہیں جاؤں گا۔ دیکھوں گا کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، پھر یہی آواز آئی: ارے سخت دشمن! تجھے ایک بات بتلاتا ہوں جس سے مراد بر آئے۔ایک فصیح شخص یوں کہہ رہا ہے: لَا إلٰهَ إلَّا اللّٰهُ۔اس وقت میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لوگ کہنے لگے: یہ (محمد ﷺ) اللہ کے سچے رسول ہیں......اس صورتِ حال نے انھیں اسلام سے قریب تر کر دیا۔

اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کمال دانائی ثابت ہوئی۔ پکارنے والا کوئی فرشتہ تھا جو آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی بشارت دے رہا تھا۔

ان کے اسلام لانے کا جو فوری سبب بنا وہ یہ ہے کہ ایک دن وہ خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کرنے کی نیت سے تلوار لے کر نکل پڑے۔ابھی راستے ہی میں تھے کہ نعیم بن عبداللہ نحام عدوی سے ملاقات ہوگئی۔اس نے تیور دیکھ کر پوچھا: عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر نے کہا: محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جارہا ہوں۔ اس نے کہا: محمد (ﷺ) کو قتل کر کے بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے کیسے بچ سکو گے؟ عمر نے کہا: معلوم ہوتا ہے تم بھی اپنا پچھلا دین چھوڑ کر بے دین ہو چکے ہو۔اس نے کہا: عمر! ایک عجیب بات نہ بتا دوں۔ تمھاری بہن اور بہنوئی بھی تمھارا دین چھوڑ

کر بے دین ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر عمر غصے سے بے قابو ہو گئے۔ سیدھے بہن اور بہنوئی کے گھر پہنچے۔ وہاں انھیں حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سورہ طٰہٰ پر مشتمل ایک صحیفہ پڑھا رہے تھے۔ قرآن پڑھانے کے لیے وہاں آنا جانا حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا معمول تھا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے عمر بن خطاب جیسے جری انسان کی آہٹ سنی تو گھر کے ایک گوشے میں چھپ گئے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صحیفہ چھپا دیا۔ لیکن عمر گھر کے قریب پہنچ کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی قراءت سن چکے تھے، چنانچہ پوچھا: یہ دھیمی دھیمی آواز کیسی تھی جو تم لوگوں کے ہاں میں نے سنی تھی؟ انھوں نے کہا کچھ نہیں۔ بس ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: غالباً تم دونوں بے دین ہو چکے ہو۔ بہنوئی نے پوچھا: اچھا عمر! یہ بتاؤ اگر حق تمھارے دین کے بجائے کسی اور دین میں ہو تو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اتنا سننا تھا کہ اپنے بہنوئی پر چڑھ بیٹھے اور انھیں بری طرح مارنے لگے۔ ان کی بہن نے لپک کر بھائی کو اپنے شوہر سے الگ کیا تو بہن کو ایسا چانٹا مارا کہ چہرہ خون آلود ہو گیا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ ان کے سر میں چوٹ آئی۔ بہن نے جوش غضب میں کہا: عمر! اگر تیرے دین کے بجائے دوسرا ہی دین برحق ہو تو؟ اور پھر بلند آواز سے کلمہ توحید پکارا: (أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ) میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ اور میں شہادت دیتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ انھیں اپنی بہن کے چہرے پر خون دیکھ کر شرم

بھی محسوس ہوئی۔ کہنے لگے۔ اچھا یہ کتاب جو تمھارے پاس ہے ذرا مجھے بھی پڑھنے کو دو۔ بہن نے کہا: تم ناپاک ہو۔ اس کتاب کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ اٹھو پہلے غسل کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا، پھر کتاب لی اور پڑھنے لگے۔ کہنے لگے: یہ تو بڑے پاکیزہ نام ہیں۔ اس کے بعد سورہ طٰہ سے ﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾ تک کی قراءت کی۔ کہنے لگے: یہ تو بڑا عمدہ اور بڑا محترم کلام ہے۔ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ بتاؤ!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ فقرے سن کر حضرت خباب رضی اللہ عنہ اندر سے باہر آ گئے۔ کہنے لگے: عمر خوش ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات کی رات تمہارے بارے میں جو دعا کی تھی (کہ اے اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعے اسلام کو قوت پہنچا) وہ تمہارے حق میں قبول ہوگئی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا کے پاس دارارقم میں تشریف فرما ہیں۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار حمائل کی۔ اور اس گھر کے پاس پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ ایک آدمی نے اٹھ کر دروازے کی جھری سے جھانکا تو دیکھا کہ عمر تلوار حمائل کیے موجود ہیں۔ لپک کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ سارے لوگ سمٹ کر یکجا ہو گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا: عمر آئے ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بس! عمر ہے۔ دروازہ کھول دو۔ اگر وہ خیر کی نیت سے آیا ہے تو اسے ہم عطا کریں گے۔ اور اگر کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو ہم اسی کی تلوار ہی سے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ ادھر رسول اللہ

ﷺ اندر تشریف فرما تھے۔ آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ وحی نازل ہو چکی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے۔ بیٹھک میں ان سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان کے کپڑے اور تلوار پکڑ کر انھیں سختی سے جھٹکتے ہوئے فرمایا: عمر! کیا تم اس وقت تک باز نہیں آؤ گے جب تک اللہ تعالیٰ تم پر بھی ویسی ہی ذلت ورسوائی اور عبرتناک سزا نازل نہ فرمادے جیسی ولید بن مغیرہ پر نازل ہو چکی ہے؟ یااللہ! یہ عمر بن خطاب ہے۔ یااللہ! اسلام کو عمر بن خطاب کے ذریعے قوت وعزت عطا فرما۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اُنھوں نے بلند آہنگی سے کہا: (أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) "میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ اور یقیناً آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں" یہ سن کر گھر کے اندر موجود صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مسجد الحرام والوں کو بھی سنائی دیا۔ معلوم رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زور آوری کا حال یہ تھا کہ کوئی ان سے مقابلے کی جرأت نہ کرتا تھا، اس لیے ان کے مسلمان ہو جانے سے مشرکین میں کہرام مچ گیا اور انھیں بڑی ذلت ورسوائی محسوس ہوئی۔

دوسری طرف ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی عزت وقوت، شرف واعزاز اور مسرت وشادمانی نصیب ہوئی۔ ابنِ اسحاق نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: جب میں مسلمان ہوا تو میں نے سوچا کہ مکے کا کون شخص رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا اور سخت ترین دشمن ہے؟

پھر میں نے جی ہی جی میں کہا: یہ ابو جہل ہے۔ اس کے بعد میں اس کے گھر گیا۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا: (أَهْلًا وَسَهْلًا) "خوش آمدید، خوش آمدید"۔ کیسے آنا ہوا؟ میں نے کہا: تمھیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لا چکا ہوں۔ اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (یہ سنتے ہی) اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ اور بولا: اللہ تیرا برا کرے اور جو کچھ تو لے کر آیا ہے اس کا بھی برا کرے۔

امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ اسے زدوکوب کرتے، اور وہ بھی جواباً انہیں مارتا تھا، اس لیے جب میں مسلمان ہوا تو اپنے ماموں عاصی بن ہاشم کے پاس گیا اور اسے اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع دی۔ وہ مجھ سے مُنہ موڑ کر گھر کے اندر گھس گیا، پھر میں قریش کے ایک بڑے آدمی کے پاس گیا۔ اسے خبر دی۔ وہ بھی گھر کے اندر گھس گیا۔

ابن ہشام اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو جمیل بن معمر جمحی کے پاس گئے۔ یہ شخص کسی بات کا ڈھول پیٹنے میں پورے قریش میں سب سے آگے تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے سنتے ہی بڑے زور سے چیخ کر کہا: خطاب کا بیٹا بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ بولے: یہ جھوٹ کہتا ہے۔ میں

تو مسلمان ہوا ہوں۔ یہ سن کر لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے۔ اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مار رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی پٹائی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کر بیٹھ گئے۔ لوگ سر پر سوار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا جو بن پڑے کر لو۔ اللہ کی قسم! اگر ہم لوگ تین سو کی تعداد میں ہوتے تو پھر مکے میں تم رہتے یا ہم ہی رہتے۔

اس کے بعد مشرکین نے اس ارادے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر پر ہلہ بول دیا کہ انھیں جان سے مار ڈالیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے اندر تھے کہ اس دوران ابو عَمر و عاص بن وائل سہمی آ گیا۔ وہ دھاری دار یمنی چادر کا جوڑا اور ریشمی گوٹے سے آراستہ کرتا زیب تن کیے ہوئے تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ بنو سہم سے تھا اور یہ قبیلہ زمانۂ جاہلیت میں ہمارا حلیف تھا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں، اس لیے آپ کی قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ عاص نے کہا: یہ ناممکن ہے۔ عاص کی یہ بات سن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد عاص وہاں سے نکلا۔ لوگوں سے ملا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ لوگوں کی بھیڑ سے وادی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عاص نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ لوگوں نے کہا: ہمیں خطاب کا بیٹا مطلوب ہے جو بے دین ہوگیا ہے۔ عاص نے کہا: اس طرف کوئی راہ نہیں (یعنی میں عمر کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں) یہ سنتے ہی لوگ واپس چلے گئے۔ [1]

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/215-221، وأسد الغابة: 4/139-142.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر یہ کیفیت تو مشرکین کی ہوئی، رہے مسلمان تو ان کے احوال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مجاہد رحمۃ اللہ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کس وجہ سے آپ کا لقب فاروق پڑا؟ انھوں نے کہا: مجھ سے تین دن پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کر کے آخر میں کہا: جب میں مسلمان ہوا تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم حق پر نہیں ہیں، خواہ زندہ رہیں خواہ مریں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم لوگ حق پر ہو، خواہ زندہ رہو یا موت سے دوچار ہو جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُسی وقت میں نے کہا: پھر چھپنا کیسا؟ اس ذات کی قسم! جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! ہم ضرور باہر نکلیں گے، چنانچہ ہم دو صفوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمراہ لے کر باہر آئے۔ ایک صف میں حمزہ رضی اللہ عنہ تھے اور ایک میں میں تھا۔ ہمارے چلنے سے چکی کے آٹے کی طرح ہلکا ہلکا غبار اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ قریش نے مجھے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو ان کے دلوں پر ایسی چوٹ لگی کہ اب تک نہ لگی تھی وہ لوگ مرجھا کر رہ گئے۔ بس اسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا لقب فاروق رکھ دیا۔[1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہم خانۂ کعبہ کے پاس نماز

---

[1] الإصابة مختصراً: 519/2.

پڑھنے پر قادر نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ہم خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے لگے۔[1]

حضرت صُہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اسلام پردے سے باہر آ گیا۔ اس کی علانیہ دعوت دی گئی۔ ہم حلقے لگا کر بیت اللہ کے گرد بیٹھے، بیت اللہ کا طواف کیا اور جس نے ہم پر سختی کی ہم نے اس سے انتقام لیا۔ اور اس کے مظالم کا جواب دیا۔[2]

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اُس وقت سے ہم برابر طاقتور اور باعزت ہوتے چلے گئے۔

---

[1] أسد الغابة: 4/144.

[2] صحيح البخاري، حديث: 3684. السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية، ص: 215.

23

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی استقامت

حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں لوہار تھا۔ میرا عاص پر کچھ قرضہ تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ قرضے کی واپسی کا تقاضا کیا۔'' اس نے کہا کہ میں اس وقت تک قرضہ ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں ان کا انکار ہرگز نہیں کروں گا۔ چاہے تو مر جائے اور پھر زندہ کیا جائے۔'' (میں قیامت تک انکار نہیں کر سکتا) اس نے کہا: ''اچھا! تو کیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا؟ اگر یہ بات ہے تو پھر اس وقت میرے پاس مال بھی ہوگا، اولاد بھی ہوگی، پھر میں تمھارا قرضہ ادا کر دوں گا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں:

﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ

لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾

''کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور یہ کہا کہ مجھے (دوسری زندگی میں) مال اور اولاد ملے گی، کیا اس نے غیب کی بات معلوم کر لی ہے، یا رحمٰن سے کوئی عہد لے لیا ہے۔ ہرگز نہیں، جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ہم لکھ رہے ہیں اور اس کے لیے عذاب کو آہستہ آہستہ بڑھاتے چلے جائیں گے اور جو چیزیں یہ بتا رہا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے اور یہ تو ہمارے سامنے اکیلا حاضر ہوگا۔''[1]

[1] (مریم 19: 77-80) صحیح البخاري، حدیث: 2091، وصحیح مسلم، حدیث: 2795.

24

گستاخ رسول ﷺ کو شیر نے پھاڑ کھایا

ابولہب کے بیٹوں میں سے ایک کا نام عُتیبہ تھا۔ یہ بد بخت نبی ﷺ کی ایذا رسانی میں سب سے آگے اور گستاخیٔ رسالت میں بڑا بے باک تھا۔ اس نے ایک دن یہ ناپاک جسارت کی کہ نبی ﷺ کی قمیص مبارک کو پھاڑ دیا اور آپ ﷺ کے رُوئے زیبا پر تھوکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس وحشیانہ گستاخی پر آپ ﷺ نے اس کے حق میں یہ بد دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْهِ کَلْبًا مِّنْ کِلَابِكَ"

''اے میرے پروردگار! اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کر دے۔''

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام گیا۔ جب راستے میں ''الزرقاء'' نامی جگہ پر قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ عتیبہ کو جنگل کی اس دہشت ناک فضا میں رسول اللہ ﷺ کی بد دعا یاد آئی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا، چنانچہ اسے اس بد دعا کے خوف سے اونٹوں اور قافلہ والوں کے حصار میں بڑی حفاظت سے

سلایا گیا مگر اس تدبیر پر تقدیر غالب رہی۔ رات کو اس طرف ایک شیر آ نکلا۔ قافلے والوں نے اسے دیکھا تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اور عتیبہ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے وہ بدحواس ہو کر چیخنے لگا: واللہ! یہ شیر مجھے محمد ﷺ کی بددعا کے نتیجے میں کھا جائے گا، ہر چند وہ مکہ میں ہیں اور میں یہاں شام میں ہوں مگر یہ شیر مجھے نہیں بخشے گا......۔ ایسا ہی ہوا۔ وہ شیر سارے قافلے کو پھلانگتا ہوا سیدھا عتیبہ کی طرف جھپٹا اور دیکھتی آنکھوں اُس نے عتیبہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔[1]

[1] دلائل النبوۃ للبیھقي: 339/2، مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ، ص:135، والرحیق المختوم، ص:149.

25

انوکھا مطالبہ

ابو طالب کے گھر قریش کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک نہایت خوبصورت اور سجیلا نوجوان عُمارہ بن ولید بھی تھا ۔ یہ لوگ نہایت عجیب و غریب مطالبہ اور تاریخ کے عجیب ترین سودے کی پیشکش لے کر آئے تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا: اس خوبصورت نوجوان کو اپنے بھتیجے کی جگہ رکھ لیجیے۔ اور محمد کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ تا کہ ہم اسے قتل کر دیں۔ اس کے بدلے میں عمارہ آپ کو دے دیا جائے گا۔ اس کی دیت اور نصرت کے آپ حقدار ہوں گے۔آپ اسے اپنا بیٹا بنالیں۔آپ کے بھتیجے نے آپ کے آباء واجداد کے دین کی مخالفت کی ہے۔آپ کی قوم کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ ان کی عقلوں کو حماقت سے دوچار بتلایا ہے۔اس کی سزا قتل ہے۔

ابو طالب گہری سوچ میں غرق تھے انھوں نے قریش کی ہرزہ سرائی سُنی ، پھر سر

اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ یہ عام لوگ نہیں تھے جو ان کے پاس یہ شرارت بھرا احمقانہ مطالبہ لے کر آئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے سردار اور مکہ کے دانشور کہلانے والے لوگ موجود تھے۔ ابو طالب نے بلند آہنگی سے کہا: اللہ کی قسم! یہ سودا کتنا بُرا ہے جو تم لوگ مجھ سے کرنا چاہتے ہو!! تم کیسے لوگ ہو؟ اپنا بیٹا میرے حوالے کرتے ہو تا کہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں اور پال پوس کر اس کی خدمت کروں اور میرا بیٹا مجھ سے طلب کرتے ہو تا کہ تم اسے قتل کر دو۔ اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ عبد مناف کا پڑپوتا مطعم بن عدی بولا: ابو طالب! تمھاری قوم نے تم سے انصاف کی بات کہی ہے لیکن تم ان کی کوئی بات قبول کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے جواب میں ابو طالب نے کہا: واللہ! تم لوگوں نے مجھ سے انصاف کی بات نہیں کی۔ تم میرے مخالف لوگوں کی مدد پر تلے بیٹھے ہو۔ ٹھیک ہے جو چاہو کرو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ اور ابو طالب کو یہ لوگ آئے دن طرح طرح کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ قریش دعوت حق کو روکنے کے لیے ہر حربہ اختیار کر رہے تھے۔ قریش کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو محمد رسول اللہ کی دعوت کو بزور طاقت روک دیں۔ یا آپ ﷺ کو قتل کر دیں۔ دوسری صورت آسان نہ تھی۔ ابو طالب آپ ﷺ کے محافظ تھے۔ اور کفار کے عزائم کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوئے تھے۔

چند دن پہلے والی ملاقات میں بھی سرداران قریش نے ابو طالب کو کھلی دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ آپ کا مقام و مرتبہ ہمارے نزدیک بڑا اہم ہے۔ آپ

ہمارے درمیان بڑے شرف والے ہیں آپ کی عمر کا تقاضا بھی ہے کہ آپ کا اکرام کیا جائے۔ آپ کو ہم نے کئی بار کہا ہے کہ اپنے بھتیجے کو روکیے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اب یہ معاملہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ کہ ہمارے آباء و اجداد کو گالیاں دی جائیں، ہماری عقل اور فہم کو حماقت زدہ قرار دیا جائے۔ ہمارے خداؤں کی عیب چینی کی جائے۔ اپنے بھتیجے کو روکیے ورنہ ہم آپ سے اور ان سے مقابلہ کریں گے اور ایسی جنگ چھیڑ دیں گے کہ کسی ایک فریق کا صفایا ہو کر رہے گا۔

ابو طالب پر اس دھمکی کا بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو بلایا اور کہا قریش کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور یہ یہ باتیں کہہ گئے ہیں۔ اب میرے اوپر اور خود اپنے آپ پر رحم کرو۔ اس معاملے میں مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میرے بس سے باہر ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جواب میں فرمایا: اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس کام کو پورا کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا چاہے میں اس راہ میں فنا ہو جاؤں۔

اس کے بعد آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں آپ ﷺ رو پڑے اور پھر اٹھ گئے۔ واپس جانے لگے تو ابو طالب نے پکارا۔ آپ تشریف لائے تو کہا: بھتیجے جاؤ، جو چاہو کہو اللہ کی قسم! میں تمھیں کبھی کسی وجہ سے ہرگز نہیں چھوڑوں گا، پھر انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی ہمت افزائی کے لیے اشعار کہے۔[1]

---

[1] البداية والنهاية: 55/3.

26

سارے گستاخ تڑپ تڑپ کر مر گئے

تفسیر و تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں درج ہے کہ مکہ مکرمہ میں چند شر پسند سردار آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرتے اور مختلف قسم کی ایذا رسانی کے ساتھ ساتھ برسرِعام آپ ﷺ کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ یہ کیفیت آنحضرت ﷺ کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی ۔اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ ان کی (تکلیف دہ) باتوں سے آپ کا سینہ تنگ پڑ رہا ہے۔'' [1]

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴾

''ان مذاق اڑانے والوں کے لیے آپ کی خاطر ہم کافی ہیں۔'' [1]

[1] الحجر 97:15

اسود بن ابی زمعہ، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور حارث بن قیس بن طلاطلہ، یہ پانچوں سردار آنحضرت ﷺ کا مذاق اڑانے والوں میں پیش پیش تھے۔ ایک دن آپ ﷺ کے پاس جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے، آپ ﷺ نے ان سرداروں کی شکایت کی، پھر (راہ چلتے) آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ولید بن مغیرہ دکھایا تو انھوں نے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا، آپ ﷺ نے پوچھا: جبریل یہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ ﷺ نے انھیں حارث دکھایا تو جبریل علیہ السلام نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تم نے یہ کیا کیا؟ انھوں نے جواب دیا: آپ ﷺ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہوں۔ آپ ﷺ نے انھیں عاص بن وائل دکھایا۔ انھوں نے اس کی ایڑی کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: اس کا مطلب کیا؟ انھوں نے جواب دیا: میں آپ کی طرف سے اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ ﷺ نے انھیں اسود بن مطلب دکھایا۔ انھوں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کیا؟ انھوں نے وہی جواب دیا کہ آپ کی طرف سے میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں، پھر آپ نے انھیں اسود بن عبد یغوث دکھایا تو انھوں نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: میں اس کے لیے کافی ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد ان بدبختوں کا انجام کیا ہوا؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سب

لوگ انہی اعضائے جسم کی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے جن کی طرف جبریل امین نے اشارہ کیا تھا۔ ولید بن مغیرہ کے پاؤں میں بھالا لگا۔ اس کی رگ کٹ گئی۔ وہ اسی سے مر گیا، حارث کے پیٹ میں پانی بھر گیا حتی کہ منہ سے گندگی نکلنے لگی۔ وہ اسی حالت میں مرا۔ عاص کے پاؤں میں کانٹا نما کوئی چیز چبھی۔ زخم پھیل گیا۔ وہ اسی سے مر گیا۔ اسود بن عبدالمطلب ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک چیخنے لگا: بیٹا! مجھے بچاؤ۔ میری آنکھ میں کانٹا چبھ گیا ہے۔ سخت تکلیف دے رہا ہے۔ اس نے کہا: ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اسی تکلیف سے اندھا ہو گیا۔ اسی طرح اسود بن عبد یغوث کے سر میں پھوڑا نکلا اور وہ اسی زخم کی اذیت سے جہنم کی غذا بن گیا۔[1]

یہ سب کے سب گستاخان نبوت قدرت کے انتقام کا نشانہ بنے۔ ہر چند کہ یہ کسی مسلمان کے ہاتھوں جہنم رسید نہیں ہوئے مگر خود اللہ تعالیٰ نے ان پر مختلف قسم کے عذاب مسلط کر دیے اور انھیں رسوائی کی موت مار دیا تاکہ وہ بعد میں آنے والے گستاخان رسالت مآب ﷺ کے لیے نشان عبرت بن جائیں۔ اگر اس قسم کے گستاخ اور بے ادب لوگ کسی مسلمان کے جذبۂ ایمان کے جوش انتقام سے بچ بھی گئے تو اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ اپنے لاتعداد لشکروں میں سے کسی بھی لشکر کو گستاخ رسول ﷺ پر مسلط کر دیتا ہے۔

---

[1] دلائل النبوۃ للبیهقي: 2/316-318.

ایک مرتبہ کافروں نے کہا: ہم آپ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ اللہ نے فرمایا کہ (اے رسول ﷺ!)

﴿ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴾

''ان سے کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہوں۔ تم نے اسے جھٹلایا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں کہ تمھیں عذاب میں مبتلا کر دوں جس کی تم جلدی کر رہے ہو۔ حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے۔ وہ سچی بات بیان کرتا ہے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اگر میرے اختیار میں وہ عذاب ہوتا جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا (لیکن اللہ بہت حلیم اور عالی ظرف ہے کہ عذاب میں تاخیر کر رہا ہے) بہرحال اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے (وہ انھیں وقت مقررہ پر سزا دے گا)'' [1]

---

[1] الأنعام 6:57,58.

غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جا رہی تھیں۔ ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ تبلیغِ دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں۔ اسی اثنا میں عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ ان دنوں بتوں کی پوجا عام تھی، اِس لیے عمرو ایامِ جاہلیت ہی سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ سب لوگ گمراہی پر ہیں۔ صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ جب عمرو رضی اللہ عنہ نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص (آسمانی) خبریں بیان کرتا ہے تو وہ اپنی سواری پر بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ پوشیدہ رہ کر رازداری کے ساتھ تبلیغ دین کا کام کر رہے تھے اور کفارِ قریش کی اُن ﷺ پر کڑی نظر تھی۔ بہرحال (مَنْ جَدَّ وَجَدَ) یعنی جوئندہ پایندہ کہ جسے کسی کی تلاش و جستجو ہوتی ہے، وہ اُسے بہر حال پالیتا ہے۔ عمرو اپنی دُھن کے پکے تھے۔ وہ مکہ مکرمہ پہنچے اور کسی نہ کسی طریقے سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے آپ ﷺ سے پوچھا:

"آپ کون ہیں؟"

آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نبی ہوں۔"

انھوں نے پوچھا:

"نبی کیا ہوتا ہے؟"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اللہ نے (ہادی بنا کر بھیجا) ہے۔''

انھوں نے پوچھا: اللہ نے کیا چیز دے کر آپ کو بھیجا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ان باتوں کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ صلہ رحمی کی جائے، بتوں کو توڑا جائے، اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کیا جائے۔''

انھوں نے پوچھا: آپ ﷺ کے ساتھ اس دین پر کون کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''آزاد بھی ہیں، غلام بھی ہیں۔''

یہ ارشادات سُن کر عمرو بن عبسہ اُسی دن مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ اسلام لانے والوں میں چوتھی شخصیت ہیں۔ سیدنا ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما ان سے قبل ایمان لا چکے تھے۔

عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ ﷺ کی پیروی کرتا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج کے حالات میں تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرا اور لوگوں کا کیا حال ہے؟ (سب لوگ میرے مخالف ہیں اسی وجہ سے کہیں تم بھی مصائب میں مبتلا نہ ہو جاؤ)، اس لیے اب تم اپنے گھر چلے جاؤ، پھر جب تم سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تو پھر تم میرے پاس آ جانا۔ غرض یہ کہ وہ اپنے گھر واپس چلے گئے۔[1]

[1] صحیح مسلم، حدیث:832.

28

رسول اللہ ﷺ نے بادشاہت ٹھکرا دی

ایک دن قریش کے ایک بڑے سردار عتبہ بن ربیعہ نے قریش سے پوچھا: کیوں نہ میں محمد کے ساتھ گفتگو کروں اور انہیں کچھ لے دے کر اسلام کی دعوت دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے؟

قریش نے کہا: ابوالولید! ضرور جائیے اور محمد سے بات کیجیے۔ اس کے بعد عتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: بھتیجے! تمہیں جو عزت و شرف اور مقام و مرتبہ اپنے خاندان میں حاصل ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ تمہارا نسب نامہ نہایت بلند پایہ ہے۔ اب تم ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کی وجہ سے قوم میں تفرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ تم نے ان کے معبودوں کو جھٹلایا۔ اپنے آباء و اجداد کو کافر قرار دیا۔ میں تمھارے سامنے کچھ چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان پر خوب غور کرو۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی بات تمہیں پسند آ جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

ابوالولید تم کہو، میں سنوں گا۔

عتبہ کہنے لگا: جو دعوت تم لے کر آئے ہو اگر اس سے مال حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار بن جاؤ گے۔ اگر سرداری درکار ہے تو ہم متفقہ طور پر تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ ہمارا ہر معاملہ تمہارے مشورے اور حکم سے طے پائے گا۔ اگر تم کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو مکہ کی جس لڑکی کی طرف اشارہ کرو اس سے تمہیں بیاہ دیتے ہیں۔ اور اگر تمہارے اوپر کسی جن بھوت کا سایہ ہے تو ہم تمہارا علاج کرانے کے لیے بھی تیار ہیں تاکہ تم شفایاب ہو جاؤ۔ عتبہ اپنی باتیں کہتا رہا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنی لچھے دار باتوں سے محمد ﷺ کو کسی نہ کسی شرط پر راضی کر لے گا۔ اس نے اپنی ہفوات ختم کیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور دریافت فرمایا: ابوالولید کیا تمہاری بات ختم ہو گئی؟ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کچھ میری باتیں بھی سنو گے؟ اس نے کہا: ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ اب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی شیر وشہد جیسی آواز میں سورۂ حٰم سجدہ کی آیات کی تلاوت شروع کی:

''حٰم یہ رحمٰن اور رحیم کی طرف سے نازل کی ہوئی ایسی کتاب ہے۔ جس کی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ (یہ) عربی قرآن (ہے) ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے لیکن اکثر لوگوں نے اعراض کیا اور وہ سنتے نہیں۔''[1]

اللہ کے رسول ﷺ پڑھتے جارہے تھے اور عتبہ مبہوت ہوکر سن رہا تھا۔ جب سجدے کی آیت آئی تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور فرمایا: ابوالولید! تمھیں جو کچھ سننا تھا، سن چکے اب تم جانو اور تمہارا کام۔

قریش عتبہ کے منتظر تھے۔ جب اُسے واپس آتے دیکھا تو اس کے ظواہر (Body language) دیکھ کر کہنے لگے: اللہ کی قسم! یہ شخص جو چہرہ لے کر گیا تھا اب اس کے ساتھ واپس نہیں آرہا۔ جب عتبہ واپس پہنچ کر ان لوگوں میں بیٹھ گیا تو انہوں نے پوچھا: ہاں ابوالولید! کیا خبر ہے؟ تمہاری پیشکش اور تمہاری تجاویز کا کیا بنا؟ عتبہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا: میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک نہیں سنا۔ خدا کی قسم! نہ تو وہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت، اے قریش! میری بات مانو۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ جو گفتگو میں نے سنی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا واقعہ رونما ہوکر رہے گا۔ اگر اسے عربوں نے مار ڈالا تو تمہارا کام دوسروں کے ہاتھوں انجام پا جائے گا۔ اور اگر یہ غالب آ گیا تو اس کی بادشاہت تمہاری اور اس کی عزت تمہاری ہی عزت کا باعث ہوگی۔ قریش نے اس کی طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا: تم پر بھی اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔ عتبہ بولا: اب جیسے تمہاری مرضی، میں نے بہر حال اس کے بارے میں اپنی رائے دے دی ہے۔[1]

[1] تفسیر القرطبي: 296/15، ومجمع الزوائد: 20/6۔

29

نضر بن حارث کا کردار

نضر بن حارث کا واقعہ یہ ہے کہ اس نے ایک بار قریش سے کہا: ''قریش کے لوگو! خدا کی قسم! تم پر ایسی افتاد آن پڑی ہے کہ تم لوگ اب تک اس کا کوئی توڑ نہیں کر سکے۔ محمد ﷺ جوان تھے تو تمھارے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔ سب سے زیادہ سچے اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھے۔ اب ان کی کنپٹیوں پر سفیدی چمکنے والی ہے اور وہ ادھیڑ عمر ہو چلے ہیں اور تمھارے پاس چند باتیں لے کر آئے ہیں تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہیں۔ نہیں واللہ! وہ جادوگر نہیں۔ ہم نے جادوگر دیکھے ہیں۔ ان کی جھاڑ پھونک اور گرہ بندی بھی دیکھی ہے۔ تم لوگ کہتے ہو وہ کاہن ہیں۔ نہیں واللہ! وہ کاہن بھی نہیں۔ ہم نے کاہن بھی دیکھے ہیں، ان کی الٹی سیدھی حرکتیں بھی دیکھی ہیں اور ان کی فقرہ بندیاں بھی سنی ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ شاعر ہیں۔ نہیں واللہ! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے شعر بھی سُنے اور اس کے سارے اصناف، ھجز، رجز وغیرہ سے ہم خوب آگاہ ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ پاگل ہیں۔ نہیں، واللہ! وہ پاگل بھی نہیں، ہم نے پاگل پن بھی دیکھا ہے۔ یہاں نہ اس طرح کی گھٹن ہے نہ ویسی بہکی بہکی باتیں، نہ ان جیسی فریب کارانہ گفتگو۔ قریش

کے لوگو! سوچو! اللہ کی قسم تم پر زبردست افتاد آن پڑی ہے۔"

اس کے بعد نضر بن حارث حیرہ گیا، وہاں بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفندیار کے قصے سُنے اور سیکھے، پھر واپس آیا۔ اب اس کا معمول یہ ہوگیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی باتیں کرتے اور اس کی گرفت سے لوگوں کو ڈراتے تو آپ ﷺ کے ارشادات کے بعد یہ شخص وہاں پہنچ جاتا اور کہتا: واللہ! محمد ﷺ کی باتیں مجھ سے بہتر نہیں۔ اس کے بعد وہ فارس کے بادشاہوں اور رستم و اسفندیار کے قصے کہانیاں سناتا، پھر کہتا: آخر کس بنا پر محمد ﷺ کی بات مجھ سے بہتر ہے؟[1]

ابن عباس کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نضر نے چند لونڈیاں خرید رکھی تھیں۔ جونہی وہ کسی آدمی کے متعلق سنتا کہ وہ نبی ﷺ کی طرف مائل ہے تو اس پر ایک لونڈی مسلط کر دیتا جو اسے کھلاتی پلاتی رجھاتی اور گانے سناتی یہاں تک کہ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ باقی نہ رہنے دیتی۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد اسی سلسلے میں نازل ہوا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

"کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو کھیل تماشے کی بات خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکائیں۔"[2]

---

(1) السیرة النبویة لابن ہشام: 1/299،300،358.

(2) الدر المنثور: 5/307.

(3) سورۃ لقمان: 31:6

30

ستم گر اپنے انجام کو پہنچ گئے

عُقبہ بن ابی مُعیط اپنی بدبختی اور خباثت میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے کچھ رفقاء بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ بعض نے بعض سے کہا: کون ہے جو بنو فلاں کے اونٹ کی اوجھڑی لائے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے؟ اس پر بدبخت ترین شخص عقبہ بن ابی معیط اٹھا۔ اوجھ اُٹھا لایا اور انتظار کرنے لگا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گئے تو اس نے اسے آپ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دیا۔ میں یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کاش مجھ میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کی طاقت ہوتی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک

دوسرے پر گرنے لگے۔ اور رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں پڑے رہے۔ سَر نہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آ گئیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کی پیٹھ سے اوجھ ہٹا کر پھینکی تب آپ نے سَر اٹھایا، پھر تین بار فرمایا: ﴿اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ﴾ ''اے اللہ! قریش کو پکڑ لے۔'' آپ ﷺ نے بددعا کی تو ان پر بہت گراں گزری۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے اس گھر میں دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے نام لے لے کر بددعا کی: اے اللہ! ابوجہل کو پکڑ لے۔ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے گن گن کر لیے تھے، وہ سب کے سب مقتول ہو کر بدر کے گندے کنویں میں پڑے تھے۔ ان بدبختوں میں عقبہ بن ابی معیط بھی شامل تھا۔[1]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3185,240.

31

ابوجہل کے کرتوت

ابوجہل کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا تھا اور قرآن سنتا تھا۔ بس سنتا ہی تھا۔ آگے نہیں بڑھتا تھا۔ ایمان واطاعت اور ادب وخشیت اختیار کرنا تو اس کی قسمت میں ہی نہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی باتوں سے اذیت پہنچاتا اور اللہ کی راہ سے روکتا تھا، پھر اپنی اس گھٹیا حرکت پر فخر بھی کرتا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیات اسی شخص کے بارے میں نازل ہوئیں:

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۙ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۙ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ؕ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۙ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾

''نہ اس نے سچ مانا، نہ نماز پڑھی۔ بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ پھیری، پھر وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔ تیرے لیے ہلاکت در ہلاکت ہے،

پھر تیرے لیے ہلاکت در ہلاکت ہے۔"

اس شخص نے پہلے دن جب نبی ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اسی دن سے آپ ﷺ کو نماز سے روکنے لگا۔ ایک دفعہ نبی ﷺ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ اس کا گزر ہوا۔ دیکھتے ہی بولا: محمد! کیا میں نے تجھے اس سے منع نہیں کیا تھا؟ ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ڈانٹ کر سختی سے جواب دیا۔ اس پر وہ کہنے لگا: اے محمد! کاہے کی دھمکی دے رہے ہو، دیکھو اللہ کی قسم! اس وادی (مکہ) میں میرا جتھا سب سے بڑا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴾ "اچھا! تو بلا لے اپنی ٹولی کو ہم بھی عنقریب سزا کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔"[1]

ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا:

﴿ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴾

"تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔"

اس پر اللہ کا دشمن کہنے لگا: اے محمد! مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تم اور تمھارا پروردگار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں مکے کی دونوں پہاڑیوں کے مابین چلنے پھرنے والوں میں سب سے زیادہ معزز ہوں۔[2]

---

[1] القيامة 75/31-35. [2] جامع الترمذي، حديث: 3349.

[3] تفسیر ابن کثیر: 4/477، والدر المنثور: 6/478.

بہر حال اس ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے باوجود ابوجہل اپنی حماقت سے باز نہیں آیا۔ بلکہ اس کی بدبختی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار ابوجہل نے سردارانِ قریش سے کہا: محمد آپ لوگوں کے رُوبرو اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں، اس نے کہا: لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے (اس حالت میں) اسے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا۔ اور اس کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔ اس کے بعد اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور اس زعم میں چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن روند دے گا۔ لیکن لوگوں نے اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایڑیوں کے بل پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا: ابوالحکم! تمھیں کیا ہوا؟ اس نے کہا: میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے۔ ہولناکیاں ہیں۔ اور پَر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب آجاتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو نوچ لیتے۔[1]

ابوجہل جب کسی معزز اور طاقتور آدمی کے مسلمان ہونے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا ذلیل و رسوا کرتا اور مال و جان کو سخت خسارے سے دو چار کرنے کی دھمکیاں دیتا اور اگر کوئی کمزور آدمی مسلمان ہوتا تو اسے مارتا پیٹتا اور دوسروں کو بھی بدسلوکی پر اُکساتا تھا۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث 2797.

32

لکڑیاں ڈھونے والی بدبخت عورت

ابولہب کی بیوی ام جمیل کا نام اروئ تھا وہ حرب بن امیہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن تھی، وہ بھی نبی ﷺ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی۔ وہ بدبخت رات کے وقت نبی ﷺ کے راستے اور دروازے پر کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ بدزبان اور جھگڑالو تو تھی ہی، چنانچہ نبی ﷺ کے خلاف بدزبانی کرنا، لمبی چوڑی دسیسہ کاری وافترا پردازی سے کام لینا، فتنے کی آگ بھڑکانا، اور خوفناک جنگ بپا رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ اسی لیے قرآن نے اس کا ذکر ﴿ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴾ ''لکڑی ڈھونے والی'' (چغل خور) کے لقب سے کیا ہے۔

جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مَذَمّت میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپ ﷺ مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے پاس تشریف فرما تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ مُٹھی

میں پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھتی رہی۔ اس نے سامنے پہنچتے ہی سوال کیا: ابوبکر تمھارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ واللہ! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو اسکے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔ دیکھو! اللہ کی قسم! میں بھی شاعرہ ہوں، پھر اس نے یہ شعر سنایا۔

(مُذَمَّمًا عَصَيْنَا۔ وَأَمْرَهُ أَبَيْنَا۔ وَدِينَهُ قَلَيْنَا)

''ہم نے مذمم کی نافرمانی کی۔ اس کے حکم کو تسلیم نہ کیا اور اس کے دین کو نفرت وحقارت سے چھوڑ دیا۔''

اس کے بعد یہ بدفطرت عورت واپس چلی گئی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا اس نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اللہ نے اس کی نگاہ معطل کر دی تھی۔ [1]

امام ابوبکر بزار نے بھی یہ واقعہ روایت کیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ جب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی تھی تو اس نے یہ بھی کہا: ابوبکر! تمھارے ساتھی ﷺ نے ہماری ہجو کی ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں اس عمارت کے رب کی قسم، نہ وہ شعر کہتے ہیں نہ اسے زبان پر لاتے ہیں۔ اس نے کہا: تم سچ کہتے ہو (مطلب یہ تھا کہ تمہارے بارے میں جو کہا اللہ تعالی نے کہا، محمد ﷺ نے اپنی

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 356/1.

طرف سے تو کچھ بھی نہیں کہا)۔ [1]

کسی شاعر نے ام جمیل کے اس ہذیان کا جواب یوں دیا ہے:

(مُحَمَّدًا أَطَعْنَا۔ وأَمْرَهُ قَبِلْنَا۔ وَدِينَهُ رَضِينَا۔ وَنَفْسَهُ فَدَيْنَا)

''ہم نے محمد ﷺ ہی کی اطاعت کی، انہی کے حکم کو قبول کیا۔ ان کے دین پر ہم راضی ہوئے۔ ان پر ہماری جانیں قربان ہوں''۔

[1] المستدرک للحاکم: 2/361، ومصنف ابن أبي شیبة: 11/498، حدیث: 11817، وفي السیاق اختلاف یسیر.

ابولہب غارت ہوا

نبی اکرم ﷺ کے اعلان نبوت پر آپ کی مخالفت کرنے والا سب سے پہلا شخص آپ کا حقیقی چچا ابولہب تھا اس شخص نے ایک طرف تو آپ ﷺ کی ولادت کی خوشی میں اپنی لونڈی آزاد کی مگر دوسری طرف اعلان نبوت پر پہلی ہی دعوتی مجلس میں نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب بھی کیا اور پھر اس کا سارا گھرانہ ہی پیغمبر ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیوں پر اتر آیا جب آیت کریمہ ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر خاندانِ قریش کو آواز دینا شروع کی...... اے بنی فہر! اے بنی عدی! ...... یہاں تک کہ سب کے سب اکٹھے ہوگئے۔ حتی کہ اگر کوئی آدمی خود نہیں جا سکتا تھا تو اس نے اپنا قاصد بھیج دیا کہ دیکھیے معاملہ کیا ہے؟ غرض سارے قریش آ گئے۔ ابولہب بھی آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ یہ بتاؤ! اگر میں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کی ایک جماعت ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ لوگوں نے کہا: بے شک ہم نے آپ ﷺ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا تو میں تمھیں ایک سخت عذاب سے

آگاہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (جو دشمن کے حملے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے) اس پر ابولہب نے کہا: تو غارت ہو۔ کیا تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا؟ اس پر سورۃ ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ نازل ہوئی کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ غارت ہوں اور وہ خود بھی غارت ہو۔[1]

درحقیقت نبی ﷺ کے بارے میں ابولہب کا موقف روز اول ہی سے، جبکہ ابھی قریش نے اس طرح کی کوئی مخالفانہ بات سوچی بھی نہ تھی، یہی رہا۔ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس نے کوہ صفا پر نبی ﷺ کو مارنے کے لیے ایک پتھر بھی اٹھالیا تھا۔ اسی طرح جب نبی ﷺ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو ابولہب اس قدر خوش ہوا کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے رفقاء کے پاس پہنچا اور انھیں یہ خبر سنائی کہ محمد ﷺ ابتر (نسل بریدہ) ہوگئے۔[2] ایام حج میں بھی ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدبخت آپ ﷺ کی تکذیب ہی پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ پتھر بھی مارتا تھا جس سے آپ ﷺ کی مبارک ایڑیاں خون سے رنگین ہو جاتی تھیں۔[3]

قرآن مجید میں اس ناہنجار کے حالت کفر میں مرنے کی پیشین گوئی کی گئی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور وہ انتہائی ذلت کی موت مرا۔ اس کا اس طرح کے انجام سے دوچار ہونا نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4770، وصحیح مسلم، حدیث:208.

[2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ الکوثر:4/595. [3] کنز العمال:12/449.

34

ظلم وستم کی دستاویز کیڑوں کی غذا بن گئی

جب قریش کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ گئیں اوران کا رویہ نہایت جارحانہ ہوگیا توان سنگین حالات میں ابو طالب نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنے جد امجد عبد مناف کے دو صاحبزادوں ہاشم اور مطلب کے ذریعے وجود میں آنے والے دونوں خاندانوں کو جمع کیا۔ اور کہا: میں آج تک اکیلا اپنے بھتیجے کی حفاظت اور دفاع کرتا رہا۔ اب تم سب مل کر یہ فریضہ انجام دو۔ عربی حمیت اور غیرت کا تقاضا یہی تھا۔ ان دونوں خاندانوں کے سبھی کافر اور مسلمان افراد نے ابو طالب کی تجویز قبول کر لی۔ صرف بد بخت ابولہب ہی ایسا شخص تھا جو سارے خاندان سے الگ ہو کر مشرکین سے جا ملا اوران کا ساتھ دیا۔

ادھر قریش بھی غافل نہ تھے۔ انہیں ابو طالب کی تدابیر اور حضرت محمد ﷺ کی حفاظت کے لیے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اکٹھے ہونے کی متواتر اطلاعات مل رہی

تھیں۔اب ان کے لیے قتل کے منصوبہ پر عمل کرنا آسان نہ تھا۔انہوں نے ایک اور تدبیر سوچی۔ یہ ظلم وستم کی ایک ایسی تجویز تھی جواب تک کی تمام کاروائیوں سے زیادہ سنگین تھی۔ مشرکین وادی محصب میں جمع ہوئے اور طے کیا: ہم بنو ہاشم اور بنو مطلب کا سوشل بائیکاٹ کریں گے۔ ہم ان سے شادی بیاہ کریں گے نہ لین دین کریں گے۔ خرید و فروخت کریں گے نہ ان کے گھروں میں جائیں گے اور نہ ہی بات چیت کریں گے۔ ان سے ہمارا یہ بائیکاٹ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ اللہ کے رسول ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ہمارے حوالے نہ کردیں۔ یہ ظالمانہ فیصلہ باقاعدہ دستاویز کی شکل میں لکھا گیا جس میں مندرجہ بالا تمام عہد و پیمان شامل تھے۔ صلح کے تمام دروازے بند کردیے گئے اور عہد کرلیا گیا کہ وہ بنو ہاشم کی طرف سے صلح کی کسی بھی پیشکش کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ دستاویز ایک شخص بغیض بن عامر بن ہاشم نے قلم بند کی تھی۔ اس بد بخت کا ہاتھ شل ہوگیا۔ اس عہد و پیمان کے بعد اس دستاویز کو کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا اور ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام لوگ شعب ابی طالب میں محبوس ہوگئے۔شعب ابی طالب شہر سے ہٹ کر مکہ کے مشرق میں جبل حراء کے قریب ایک گھاٹی ہے۔

یہ اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے ساتویں سال محرم کی چاند رات کا واقعہ ہے۔ اس بائیکاٹ کے نتیجے میں حالات نہایت سنگین ہوگئے۔ غلے اور سامان خورد و نوش کی آمد بند ہوگئی کیونکہ مکے میں جو غلہ یا فروخت کا سامان آتا تھا اسے مشرکین پہلے ہی سے لپک کر خرید لیتے تھے، اس لیے محصورین کی حالت نہایت پتلی ہوگئی۔

انہیں پتے اور چمڑے کھانے پڑے۔ فاقہ کشی کا حال یہ تھا بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں اور عورتوں کی آوازیں گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھیں۔ ان کے پاس بمشکل ہی کوئی چیز پہنچ پاتی تھی، وہ بھی خفیہ طور پر پس پردہ۔ وہ لوگ حرمت والے مہینوں کے علاوہ باقی ایام میں اشیائے ضرورت کی خرید کے لیے گھاٹی سے باہر نکلتے بھی نہ تھے۔ اور انہی قافلوں کا سامان خرید سکتے تھے جو باہر سے مکہ آتے تھے۔ لیکن ان کے سامان کے دام بھی مکے والے اس قدر بڑھا چڑھا کر خریدنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے کہ غریب محصورین کے لیے کچھ خریدنا محال ہو جاتا تھا۔

حکیم بن حزام جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا، کبھی کبھی اپنی پھوپھی کے لیے گیہوں بھجوا دیتا تھا۔ ایک بار ابو جہل سے سابقہ پڑ گیا۔ وہ غلہ روکنے پر اڑ گیا۔ لیکن ابوالبختری نے مداخلت کی اور حکیم کو اس کی پھوپھی کے پاس بھجوا دیا تا کہ وہ گیہوں اسے دے آئے۔

ادھر ابو طالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برابر خطرہ لگا رہتا تھا، اس لیے جب لوگ اپنے اپنے بستروں پر جاتے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے: تم اپنے بستر پر سو جاؤ۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی ظالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت رکھتا ہو تو دیکھ لے کہ آپ کہاں سو رہے ہیں، پھر جب سب لوگ سو جاتے تو ابو طالب اُٹھتے اور آپ کی جگہ بدل دیتے تھے، یعنی اپنے بیٹوں، بھائیوں یا بھتیجوں میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سلا دیتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اب تم اس کے بستر پر چلے جاؤ۔

ان حالات پر پورے تین سال بیت گئے۔ اس کے بعد محرم 10 نبوی میں صحیفہ چاک کیے جانے اور اس ظالمانہ عہد و پیمان کے خاتمے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع ہی سے قریش کے کچھ لوگ اس عہد و پیمان سے راضی تھے تو کچھ ناراض بھی تھے۔ اور انہی ناراض لوگوں نے اس صحیفے کو چاک کرنے کی تگ و دو کی۔

اس کے خاتمہ کا اصل محرک قبیلہ بنو عامر بن لوئ کا ہشام بن عمرو نامی ایک شخص تھا۔ یہ رات کی تاریکی میں چپکے چپکے شعب ابی طالب کے اندر غلہ بھیج کر بنو ہاشم کی مدد بھی کرتا تھا۔ یہ زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس پہنچا۔ زہیر کی ماں عاتکہ، عبدالمطلب کی صاحبزادی، یعنی ابو طالب کی بہن تھیں۔ اس نے زہیر سے کہا: کیا تمہیں یہ گوارا ہے کہ تم تو مزے سے کھاؤ، پیو اور تمہارے ماموں کا وہ قابل رحم حال ہے جسے تم خوب جانتے ہو؟ زہیر نے کہا: افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ ہاں اگر میرے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اس صحیفے کو پھاڑنے کے لیے یقیناً چل پڑتا۔ اس نے کہا: اچھا تو ایک آدمی اور موجود ہے۔ پوچھا: کون ہے؟ کہا: میں ہوں۔ زہیر نے کہا: اچھا تو اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔

اس پر ہشام، مُطعم بن عدی کے پاس گیا۔ اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے جو عبد مناف کی اولاد تھے، مطعم کے قریبی نسبی تعلق کا ذکر کر کے اسے ملامت کی اور کہا کہ تم نے اس ظلم پر قریش کی ہمنوائی کیوں کی؟ یاد رہے کہ مطعم بھی عبد مناف ہی کی نسل سے تھا۔ مطعم نے کہا: افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ ہشام نے کہا: ایک

آدمی اور موجود ہے۔ مطعم نے پوچھا: کون ہے؟ ہشام نے کہا: میں۔ مطعم نے کہا: اچھا اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔ ہشام نے کہا: تلاش کر چکا ہوں۔ پوچھا: وہ کون ہے؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ، مطعم نے کہا: اچھا تو اب چوتھا آدمی تلاش کرو۔ یہ سن کر ہشام بن عمرو، ابوالبختری بن ہشام کے پاس گیا۔ اس سے بھی اسی طرح کی گفتگو کی جیسی مطعم سے کی تھی۔ اس نے کہا: بھلا کوئی اس کی تائید بھی کرنے والا ہے؟ ہشام نے کہا: ہاں۔ پوچھا: کون؟ کہا: زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی۔ اور میں۔ اس نے کہا: اچھا تو اب پانچواں آدمی ڈھونڈو...... اس کے لیے ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد کے پاس گیا۔ اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے بنو ہاشم کی قرابت اور ان کے حقوق یاد دلائے۔ اس نے پوچھا: تم جس کام کے لیے مجھے بلا رہے ہو اس سے کوئی اور بھی متفق ہے؟ ہشام نے اثبات میں جواب دیا اور سب کے نام بتلائے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حجون کے پاس جمع ہو کر آپس میں یہ عہد و پیمان کیا کہ ہم صحیفہ چاک کر دیں گے۔ زہیر نے کہا: میں ابتدا کروں گا، یعنی سب سے پہلے میں ہی زبان کھولوں گا۔

اُس وقت ابوجہل مسجد حرام کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا وہ بولا: تم غلط کہتے ہو۔ اللہ کی قسم! اسے پھاڑا نہیں جا سکتا۔

اس پر زمعہ بن اسود نے ابوجہل سے کہا: واللہ! تم بالکل غلط کہتے ہو۔ جب یہ صحیفہ لکھا گیا تھا تب بھی ہم اس پر راضی نہ تھے۔

اس پر ابوالبختری نے گرہ لگائی: زمعہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا

ہے اس سے نہ ہم راضی ہیں نہ اسے ماننے کو تیار ہیں۔ اس کے بعد مطعم بن عدی نے کہا: تم دونوں ٹھیک کہتے ہو۔ اور جو اس کے خلاف کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ ہم اس صحیفے سے اور اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے اللہ کے حضور براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ہشام بن عمرو نے بھی اسی طرح کی بات کہی۔

یہ ماجرا دیکھ کر ابو جہل نے کہا: ہونہہ! یہ بات رات ہی کو طے کی گئی ہے۔ اور اس کا مشورہ یہاں کے بجائے کہیں اور کیا گیا ہے۔

اس دوران ابو طالب بھی حرم پاک کے ایک گوشے میں موجود تھے۔ ان کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس صحیفے کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے کیڑے لگا دیے ہیں۔ جو ظلم وستم اور قرابت شکنی کی ساری باتیں چٹ کر گئے ہیں۔ اور صرف اللہ عزوجل کا ذکر باقی چھوڑا ہے، نبی ﷺ نے اپنے چچا کو یہ بات بتائی تو وہ قریش سے یہ کہنے آئے تھے کہ ان کے بھتیجے نے انہیں اس صحیفے کے عہد و پیمان چٹ ہو جانے کی خبر دی ہے اگر وہ جھوٹا ثابت ہوا تو ہم تمہارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں گے، پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔ لیکن اگر وہ سچا ثابت ہوا تو تمہیں ہمارے بائیکاٹ اور ظلم سے باز آنا ہوگا۔ اس پر قریش نے کہا: آپ انصاف کی بات کہہ رہے ہیں۔

ادھر ابو جہل اور باقی لوگوں کی نوک جھونک ختم ہوئی تو مطعم بن عدی صحیفہ چاک کرنے کے لیے اٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ واقعی کیڑوں نے اس کا صفایا کر دیا ہے۔

صرف بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ باقی رہ گیا ہے۔ اور جہاں جہاں اللہ کا نام درج تھا صرف وہی جگہ محفوظ ہے۔ کیڑوں نے اسے نہیں کھایا تھا۔ باقی سارا صحیفہ کیڑے ہڑپ کر گئے ہیں۔

اس کے بعد صحیفہ چاک کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اور بقیہ تمام حضرات شعب ابی طالب سے نکل آئے۔ یوں مشرکین نے آپ ﷺ کی نبوت کی ایک عظیم الشان نشانی دیکھ لی۔ اور یہ ظالمانہ اور سنگدلانہ سوشل بائیکاٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا[1]

---

[1] زاد المعاد: 46/2، وسیدنا محمد رسول اللہ ﷺ الأسوۃ الحسنۃ: 192/1، والرحیق المختوم: 157-161.

35

سردار کے ہاتھوں سردار کی آزادی

ابی بن خلف کا بھائی امیہ بن خلف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آقا تھا۔ وہ اسلام لانے کی پاداش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر انتہائی بہیمانہ مظالم ڈھایا کرتا تھا۔ گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا مگر وہ اس کی بات ماننے کی بجائے ''احد احد'' پکارتے رہتے۔ ایک مرتبہ ورقہ بن نوفل وہاں سے گزرے۔ بلال پر ہونے والا ظلم دیکھ کر کہنے لگے: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو میں انتہائی دردناک آواز سے اس کے مظلومانہ قتل کا چرچا کروں گا۔ حضرت بلال کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جاتا تو فرماتے کہ میری زبان پر کُفر کے الفاظ کبھی نہیں آ سکتے۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے بندے پر رحم آ گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ظلم کا صدمہ

برداشت نہ کر سکے۔ امیہ سے کہا کہ اس مسکین کے بارے میں اپنے رب سے ڈرو۔ اس پر کیوں اتنا ظلم کرتے ہو؟ آخر کب تک یہ مشق ستم جاری رکھو گے؟ اس کے منہ سے نکل گیا: اگر اس سے اتنی ہی محبت ہے تو اسے بچا لو۔ جیسے ہی امیہ نے اشارہ دیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدنے کے لیے فورا تیار ہو گئے۔ پانچ اوقیہ سونے کے عوض سودا کر لیا۔ امیہ کہنے لگا تم نے تو بڑی قیمت لگا دی۔ میں تو اسے ایک اوقیہ میں بھی بیچنے پر تیار تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم اگر تم بلال رضی اللہ عنہ کی دس اوقیہ بھی قیمت لگاتے تو میں انہیں خرید کر آزاد کر دیتا۔ (یاد رہے کہ اوقیہ کا وزن آج کے اعشاری نظام میں 31 گرام کے برابر ہوتا ہے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ (اَبُوبَكْرٍ سَيِّدُنَا وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا) ''ہمارے سردار ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمارے سردار بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کرایا۔''[1]

---

[1] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 3/233،232، والكامل في التاريخ: 1/589.

36

رحمت عالم نے پھر بھی بددعا نہ کی

صحیح بخاری میں روایت ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ پر احد کے دن سے زیادہ بھی کوئی سخت اور سنگین دن گزرا ہے؟۔ ارشاد ہوا: ہاں تمھاری قوم کے ہاتھوں مجھے جن مصائب کا شکار ہونا پڑا ان میں سب سے مشکل اور سنگین دن وہ تھا جب میں اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے طائف گیا تھا......۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینے کے لیے قبیلہ بنو ثقیف کے تین با اثر سرداروں کا انتخاب کیا۔ ان کے ہاں قبیلہ بنو جمح کی ایک قریشی عورت بھی بیاہ کر گئی ہوئی تھی۔ یہ تینوں سردار عمرو بن عمیر ثقفی کے بیٹے عَبد یا لِیل، مسعود اور حبیب تھے۔ یہ بنو ثقیف کے رئیس اور سربراہ تھے۔ جب ان کو عقیدۂ توحید کی

دعوت دی گئی تو ان کے جوابات ایک سے ایک بڑھ کر کرخت اور بے ہودہ تھے۔ عبد یا لیل کہنے لگا: اگر اللہ نے واقعی تمھیں رسول بنایا ہے تو میں کعبے کا غلاف پھاڑ دوں گا، مسعود بولا: کیا اللہ کو تمھارے علاوہ اور کوئی نہیں ملا جسے نبوت عطا کی جاتی۔ اور حبیب کہنے لگا: میں ان سے ہرگز بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر واقعی یہ نبی ہیں تو ان کے خلاف زبان ہلانا بے ادبی ہے۔ اور ان کی بات رد کرنا میرے لیے انتہائی خطرناک ہے اور اگر انہوں نے اللہ پر جھوٹ گھڑ رکھا ہے تو اس صورت میں بھی مجھے ان سے بات نہیں کرنی چاہیے۔

یہ نامعقول گفتگو سن کر آپ ﷺ یقیناً رنجیدہ ہوئے۔ ان سے فرمایا: ٹھیک ہے تم نے میری بات نہیں مانی مگر یہ گفتگو اپنے تک ہی محدود رکھنا، اس کا چرچا نہ کرنا۔ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ یہ خبر قریش تک نہ پہنچے تا کہ وہ اپنی سختی میں مزید اضافہ نہ کر دیں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ شریف لوگ نہیں تھے۔ ابن ہشام کے مطابق انھوں نے نہایت گھٹیا طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ نہ صرف علاقے میں منادی کرا دی بلکہ شہر کے تمام اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔

آپ ﷺ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ آپ کے آزاد کردہ محبوب غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے شریک سفر تھے۔ آپ ﷺ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو سرداروں کی شہ پر طائف کے اوباش پیچھے لگ گئے۔ وہ گالیاں دے رہے تھے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آپ ﷺ کے دونوں جانب ہجوم ہو گیا۔ گالیوں اور بدزبانیوں کے

ساتھ ساتھ اب پتھراؤ بھی ہونے لگا۔ جس سے آپ ﷺ کی ایڑی پر اتنے زخم آئے کہ دونوں جوتے خون سے رنگین ہو گئے۔ حضرت زید بن حارثہ اپنی جان پر کھیل کر آپ ﷺ کو پتھروں سے بچاتے رہے۔ ان کا سر بھی زخمی ہو گیا۔ آپ ﷺ نے طائف سے تین میل کے فاصلے پر ایک باغ میں پناہ لی۔ کافروں کے اس وحشیانہ سلوک کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ کی اپنی امت سے محبت ملاحظہ کیجیے کہ وہ سخت رنجیدہ حالت میں تھے، سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بادل کا ٹکڑا سایہ فگن نظر آیا۔ اسی وقت جبرائیل آ پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کی قوم کے کرخت جوابات سن لیے ہیں۔ اس نے پہاڑوں کا نگران فرشتہ بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہ ان دو بڑے پہاڑوں کو ملا کر برابر کر دے اور اس قوم کو پیس دیا جائے۔ ارشاد ہوا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گی...... [1] کیا کبھی چشم فلک نے اتنے ظالمانہ سلوک کے جواب میں اِس قدر رحیمانہ برتاؤ کرنے والا مشفق اور حلیم قائد دیکھا یا سنا ہے؟ صلَّى اللهُ علَيهِ وآلهِ وسلَّم أبدًا أبدًا كثيرًا كثيرًا إلى يومِ الدِّين!

[1] صحيح البخاري، حديث: 3231، وفتح الباري: 380,379/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/32-34.

37

ایک جنتی اور دو جہنمی

قریش مکہ کے ایک بڑے زمیندار و وڈیرے ربیعہ کی زمینداری طائف میں تھی۔ انگوروں کا یہ باغ جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے پناہ لی تھی، اس کی ملکیت تھا۔ اس کے دونوں بیٹے شیبہ اور عتبہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ مخالفت اپنی جگہ مگر بہر حال رشتہ داری تو تھی ہی۔ انھوں نے اوباشوں کے چنگل سے نکلنے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کو لہولہان دیکھا تو ترس آ گیا۔ انھوں نے اپنے عیسائی غلام عداس کو بلایا اور کہا کہ ایک طشت میں انگوروں کا ایک گچھا رکھو اور اس شخص کو دے آؤ۔ جب اس نے انگور پیش کیے تو آپ نے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی بسم اللہ کہا۔ اس نے کہا: یہ جملہ، یعنی بسم اللہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔ مجھے اس کی حقیقت بتائیے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ وہ بولا: میں نینوا کا باشندہ اور عیسائی ہوں۔ ارشاد فرمایا: وہی

نینوا جہاں ایک صالح مرد یونس بن متی پیدا ہوئے تھے۔ عداس کہنے لگا: آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟۔ فرمایا کہ یونس نبی میرے بھائی تھے۔ میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ آپ کی زبان سے یہ کلمہ ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ عداس نے سر سے پاؤں تک آپ کے روئیں روئیں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ اسی دوران اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ مل گیا۔ واپس ہوا تو اس کے سینے میں نور توحید کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ شیبہ بن ربیعہ بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ عداس واپس ہوا تو کہنے لگا: اے بدنصیب! تم اس شخص کے ساتھ کس غضب کی عقیدت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کہیں اس کا مذہب قبول نہ کر لینا۔ سنو! تمھارا مذہب اس کے مذہب سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہے۔ عداس کہنے لگا: اس شخص سے بہتر روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ اس نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں وہ نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [1]

جنگ بدر میں کفار مکہ کے ساتھ ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ بھی نکلے۔ ان کے ساتھ عتبہ کا بیٹا ولید بھی تھا۔ ان کا یہی غلام عداس مکہ سے باہر ثقفیہ البیضاء کے ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں روکا اور کہا کہ یہ شخص واقعی اللہ کا رسول ہے۔ آپ لوگوں کا بدر کو جانا گویا مقتل میں جانا ہے۔ مگر ان پر جاہلی عصبیت کا بھوت سوار تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بدر جانے والے لشکر کو کھانا بھی مہیا کیا تھا۔ پہلے شیبہ نے نو اونٹ اور پھر عتبہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔ ان بدبختوں کو موت بدر میں گھیر کر لا

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 35,34/2، دیکھیے الرحیق المختوم، ص: 187.

رہی تھی۔ دنیا داری کے امور میں یہ لوگ نہایت سمجھدار تھے۔ مگر ان کے مقدر میں نجس موت اور بدر کا اندھا کنواں لکھا جا چکا تھا۔[1] واضح رہے کہ عتبہ کا ایک بیٹا ابوحذیفہ مسلمان تھا اور بدر میں شریک تھا۔ مگر عتبہ اور شیبہ کی تقدیر نے انہیں ذلت اور ہلاکت کے حوالے کر دیا۔ عداس کے دل میں سچائی کا پرستار دل دھڑک رہا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کو فوراً پہچان گیا اور دولت اسلام سے مالا مال ہو کر جنتی بن گیا لیکن عتبہ اور شیبہ بینائی رکھنے کے باوجود اندھے نکلے۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کو نہ پہچان سکے۔ ان کی نخوت، عداوت اور ہٹ دھرمی نے انہیں ذلت کی موت سے ہمکنار کیا اور جہنم کے سپرد کر دیا...... اللہ کے کام نرالے ہیں۔ ان کی حقیقت و مصلحت کون جانے!!

---

[1] السيرة الحلبية: 379/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 109/3، والبداية والنهاية: 272/3.

38

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جنات کی حاضری

جب سے رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے، جنات بھی پریشان نظر آتے تھے۔ ایک صاحب ایام جاہلیت میں کاہن تھے، بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دن وہ بازار میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک جنیہ آئی، اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ وہ کہنے لگی: ''کیا تم نے جنات کی حیرت اور مایوسی دیکھی؟ کیا ان کی ندامت کے بعد ان کی ناامیدی دیکھی؟ اور کیا تم نے لوگوں کا اونٹ والوں اور چادر اوڑھنے والوں (اہل عرب) کا تابع ہو جانے کا منظر دیکھا؟''

رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہوتے ہی جنات اور آسمان کے درمیان رکاوٹ پیدا ہوگئی اور ان پر شدت سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ ایک دن جنات اوپر سے واپس آنے کے بعد کہنے لگے: ''یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے اور اب ہم پر شدت سے چنگاریاں برسائی جاتی ہیں۔'' ان میں سے ایک جن نے کہا: ''ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان جو

رکاوٹ ہوگئی ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) ضرور کوئی نئی بات ظہور میں آئی ہے۔" پس وہ چلے۔ اور انھوں نے زمین کے مشارق و مغارب کا چکر لگایا۔ ان سب کو اس بات کی کھوج لگی ہوئی تھی کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ان کے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوگئی ہے؟ بالآخر جنات کی وہ جماعت جو سرزمین تہامہ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچ گئی۔ آپ ﷺ اس وقت مقام نخلہ میں تھے اور سوق عکاظ کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ صبح کے وقت یہ جماعت وہاں پہنچی اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب سمیت نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ کی قراءت کی آواز اُن کے کان میں آئی تو انھوں نے قرآن مجید کو بڑے غور سے سنا، پھر کہنے لگے: "یہی تو وہ چیز ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوگئی ہے۔" یہاں سے واپس وہ اپنی قوم کے پاس آئے اور کہا: "اے ہماری قوم! ہم نے قرآن سنا، وہ بڑا عجیب ہے۔ وہ ہدایت کا راستہ بتاتا ہے۔ پس ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہ کریں گے۔" اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع اپنے رسول ﷺ کو دی۔ فرمایا:

(اے میرے رسول!) "آپ کہہ دیجیے کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور پھر کہا: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کا راستہ بتاتا ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ ہمارے رب کی عظمت بہت عالی شان ہے۔ اس کی کوئی بیوی ہے نہ اولاد، ہمارے بعض بے وقوف اللہ کے بارے میں افترا پردازی کرتے تھے اور ہم یہ خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر جھوٹ نہیں بولتے۔

اورانسانوں میں سے بعض جنات کی پناہ پکڑتے تھے۔اس سے جنات کا غرور اور سرکشی اور زیادہ بڑھ جاتی تھی اور انسانوں کا بھی یہی اعتقاد تھا جیسا کہ (اے جنات) تمھارا اعتقاد تھا کہ اللہ کسی کو مبعوث نہیں کرے گا۔اور ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے مضبوط چوکیداروں اور سخت شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم آسمان میں خبریں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے لیے تیز شعلے پاتا ہے۔معلوم نہیں کہ اہل زمین کے ساتھ برائی مقصود ہے یا بھلائی۔ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے ہیں۔ ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں اور ہم نے یقین کر لیا کہ ہم زمین میں اللہ کو ہرگز نہیں ہرا سکتے، نہ بھاگ کر اسے تھکا سکتے ہیں۔ہم نے ہدایت کی کتاب سنی۔ہم اس پر ایمان لائے (اور) جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہے اور نہ ظلم کا۔ہم میں بعض مسلم ہیں اور بعض نافرمان، جو مسلم ہیں وہ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو نافرمان ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ [1]

جنات ایک مرتبہ قرآن مجید سن کر چلے گئے۔ دوسری مرتبہ پھر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جنات کی آمد کی خبر مل گئی۔ اتنے میں جنات کی طرف سے ایک بلانے والا بھی آ گیا۔رات کا وقت تھا، آپ ﷺ اس کے ساتھ چلے گئے۔صحابہ کو خبر نہ ہوئی۔وہ بہت پریشان ہوئے کہ آپ ﷺ کہاں چلے گئے۔رات بھر تلاش کرتے رہے۔ صبح کے وقت آپ ﷺ حراء سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جنات کے پاس گیا تھا۔ انھیں قرآن سنایا، پھر

[1] (الجن 72:1-15) صحيح البخاري، حديث: 773، وصحيح مسلم، حديث: 449.

آپ ﷺ صحابہ کو بھی وہاں لے گئے اور انھیں جنات کے نقوش اقدام اور آگ جلانے کے مقامات دکھائے۔اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔فرمایا: اے میرے رسول!

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

’’اور جب ہم نے کچھ جنات کو آپ ﷺ کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ قرآن سنیں۔ وہ آئے اور کہنے لگے خاموش رہو۔ واپس جا کر انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ انھوں نے کہا اے قوم! ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل ہوئی ہے وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور صراط مستقیم کی ہدایت کرتی ہے۔ اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور ایمان لے آؤ۔ تمھارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ عذاب سے بچ جاؤ گے اور جو شخص دعوت الی اللہ کو قبول نہیں کرے گا، وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔‘‘[1]

---

[1] (الأحقاف:46:29-32) صحیح مسلم، حدیث:450.

اورانسانوں میں سے بعض جنات کی پناہ پکڑتے تھے۔اس سے جنات کا غروراور سرکشی اور زیادہ بڑھ جاتی تھی اور انسانوں کا بھی یہی اعتقاد تھا جیسا کہ (اے جنات) تمھارااعتقاد تھا کہ اللہ کسی کو مبعوث نہیں کرے گا۔اور ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے مضبوط چوکیداروں اور سخت شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم آسمان میں خبریں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے لیے تیز شعلے پاتا ہے۔معلوم نہیں کہ اہل زمین کے ساتھ برائی مقصود ہے یا بھلائی۔ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے ہیں۔ ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں اور ہم نے یقین کرلیا کہ ہم زمین میں اللہ کو ہرگز نہیں ہرا سکتے، نہ بھاگ کر اسے تھکا سکتے ہیں۔ہم نے ہدایت کی کتاب سنی۔ہم اس پر ایمان لائے (اور) جو شخص بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہے اور نہ ظلم کا۔ہم میں بعض مسلم ہیں اور بعض نافرمان، جو مسلم ہیں وہ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو نافرمان ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ [1]

جنات ایک مرتبہ قرآن مجید سن کر چلے گئے۔ دوسری مرتبہ پھر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جنات کی آمد کی خبر مل گئی۔ اتنے میں جنات کی طرف سے ایک بلانے والا بھی آ گیا۔رات کا وقت تھا، آپ ﷺ اس کے ساتھ چلے گئے۔صحابہ کو خبر نہ ہوئی۔وہ بہت پریشان ہوئے کہ آپ ﷺ کہاں چلے گئے۔رات بھر تلاش کرتے رہے۔ صبح کے وقت آپ ﷺ حراء سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جنات کے پاس گیا تھا۔ انھیں قرآن سنایا، پھر

---

[1] (الجن 72:1-15) صحیح البخاري، حدیث: 773، وصحیح مسلم، حدیث: 449.

آپ ﷺ صحابہ کو بھی وہاں لے گئے اور انھیں جنات کے نقوش اقدام اور آگ جلانے کے مقامات دکھائے۔اس واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات نازل فرمائیں۔فرمایا:اے میرے رسول!

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣١﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

’’اور جب ہم نے کچھ جنات کو آپ ﷺ کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ قرآن سنیں۔ وہ آئے اور کہنے لگے خاموش رہو۔ واپس جا کر انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ انھوں نے کہا اے قوم! ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل ہوئی ہے وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور صراط مستقیم کی ہدایت کرتی ہے۔اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور ایمان لے آؤ۔تمھارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ عذاب سے بچ جاؤ گے اور جو شخص دعوت الی اللہ کو قبول نہیں کرے گا، وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا۔اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔‘‘ [1]

[1] (الأحقاف:46:29-32) صحیح مسلم،حدیث:450.

39

کسریٰ کے کنگن ایک بدو کی بانہوں میں

دو اونٹنیوں کا قافلہ تیزی سے یثرب کی طرف رواں دواں تھا۔ اب یہ بنی مُدلج کے علاقے قُدید سے گزر رہا تھا۔ ان اونٹنیوں پر چار افراد سوار تھے۔ ان میں ایک بزرگ جس کی داڑھی کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے بڑی بے تابی سے کبھی آگے کبھی پیچھے دیکھ رہے تھے۔ گویا کسی بھی خطرے کو بھانپ کر اس کا مقابلہ کرنے کی دُھن میں تھے۔ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس قافلے کے سربراہ امام الانبیاء کائنات کے امام سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ادھر بنو مُدلج کا سردار سراقہ بن مالک اپنے گھر میں اپنے حواریوں سمیت بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ اچانک ایک شخص اندر داخل ہوا۔ کہنے لگا: سراقہ! میرا خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے ساتھیوں سمیت ساحل سمندر سے گزر رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی انھیں دیکھ کر آ رہا ہوں سراقہ سمجھ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ ان دنوں مکہ کے ارد گرد تمام قبائل اور

بستیوں میں ایک ہی موضوع زیر بحث تھا کہ اس قافلے کو کس طرح روکا جائے اور انھیں زندہ یا مردہ (معاذ اللہ) قریش مکہ کے حوالے کیا جائے۔ اس مذموم کارروائی کے لیے سو سرخ اونٹوں کا انعام مقرر تھا۔ اور یہ اتنا بڑا انعام تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر شخص بے قرار تھا۔

سراقہ نے پہلو بدلا، اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا کہ یہ انعام مجھے ملنا چاہیے۔ آخر میں اس قبیلہ کا سردار ہوں۔ اور یہ قافلہ میرے ہی علاقے سے گزر رہا ہے۔ میں اس پر قابو پا سکتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص میرے ساتھ اس قافلے پر قابو پانے میں شریک ہوتا ہے تو انعام تقسیم ہوسکتا ہے۔ اس نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اس شخص کو گھورتے ہوئے کہا: تمھارا اندازہ بالکل غلط ہے۔ بھلا محمد (ﷺ) یہاں سے کہاں گزر سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں بلکہ تم نے کسی اور کو دیکھا ہے جو تمہاری نظروں کے سامنے گزرے ہیں۔ قافلہ کی خبر دینے والا شخص اب خجالت محسوس کر رہا تھا۔ ادھر سراقہ نے اپنی لونڈی کو طلب کیا اور اس کے کان میں کہا: فوراً میرے گھوڑے پر زین کسو اور اسے تیار کر کے فلاں جگہ کھڑی ہو جاؤ۔ خبردار! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ ہاں جلدی جلدی کرنا، تاخیر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ پھر وہ اہلِ مجلس کے ساتھ کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔

اس کا ذہن مسلسل قافلے کے تعاقب میں تھا۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اس کی لونڈی گھوڑا تیار کر کے مقررہ مقام پر پہنچ چکی ہو گی۔ تو اس نے اہل مجلس سے گھر

میں ضروری کام کا بہانہ کیا اور اپنے گھر کے پچھواڑے سے باہر نکل گیا۔ اس نے نیزہ سنبھالا، گھوڑے پر سوار ہو کر اسے قافلہ کی طرف دوڑایا۔ گھوڑا پوری قوت سے سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اچانک گھوڑا پھسلا اور سراقہ نیچے گر پڑا۔

اس نے اٹھ کر ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پانسے کے تیر نکالے اور یہ جاننا چاہا کہ میں انھیں ضرر پہنچا سکوں گا یا نہیں؟۔ اتفاق کی بات کہ تیر وہ نکلا جو اسے ناپسند تھا۔ فال بتا رہی تھی کہ قافلے کا پیچھا کرنا مناسب نہیں مگر سو اونٹوں کا لالچ اُسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور قافلے کے بہت قریب جا پہنچا۔ حتیٰ کہ اس کے کانوں میں اللہ کے رسول ﷺ کی قراءت کی آواز آنے لگی۔ ادھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے بے چین نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے سراقہ کو قریب آتے دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے: اللہ کے رسول ﷺ! یہ پیچھا کرنے والا اب ہمیں پکڑنے ہی والا ہے۔ ادھر عزیمت کے پہاڑ، اپنے رب پر مکمل بھروسہ کرنے والے پیغمبر ﷺ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ابوبکر! (لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا) ''میرے یارِ غار! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

سراقہ کا گھوڑا مسلسل دوڑ رہا تھا۔ بتدریج قریب ہو رہا تھا۔ ابوبکر صدیق پریشانی کے عالم میں بے اختیار رو پڑے۔ ارشاد ہوا: ابوبکر! کیوں رو رہے ہو؟۔ عرض کیا: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! میں اپنی جان کے خوف سے نہیں بلکہ آپ کی خاطر رو رہا ہوں۔

رسالت مآب ﷺ کے ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: (اَللّٰھُمَّ اکْفِنَاہُ بِمَا شِئْتَ) "اے اللہ تو جیسے چاہے اس سے ہمیں بچالے۔"

ادھر زبان اقدس سے یہ الفاظ نکلے ادھر سراقہ کا گھوڑا دوبارہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور اس مرتبہ اس کے اگلے دونوں پاؤں گھٹنوں سمیت سخت زمین میں دھنس گئے۔ اب سراقہ نے دوبارہ پانسے کے تیر سے فال نکالی۔ وہی تیر نکلا جو اسے ناپسند تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس قافلے کا پیچھا کرنا سراسر غلط کام ہے۔ جو بھی ان کا پیچھا کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ محمد (ﷺ) غالب آ کر رہیں گے۔ اس نے قافلے والوں کو پکارا اور کہا: اے محمد (ﷺ)! میں جان چکا ہوں کہ آپ (ﷺ) کی مخالفت کے باعث میرا گھوڑا زمین میں دھنس گیا ہے۔ اللہ سے دعا فرمائیے، وہ مجھے نجات دے میں نہ صرف خود آپ (ﷺ) کا تعاقب چھوڑ دوں گا بلکہ اس طرف آنے والوں کو بھی لوٹا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی تو زمین نے اسے چھوڑ دیا۔ سراقہ نے عرض کیا: (أَتَكْتُبُ لِي كِتَاباً يَكُونُ آيَةً بَيْنِي وَ بَيْنَكَ) "میرے لیے پروانہ امن لکھ دیجیے جو میرے اور آپ کے درمیان بطور نشانی رہے گا۔" آپ ﷺ نے ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ اسے امان لکھ دو۔ انھوں نے چمڑے کے ٹکڑے پر امان نامہ لکھ دیا۔ سراقہ نے آپ ﷺ کو قریش کے عزائم اور سو اونٹوں کے انعام کے بارے میں آگاہ کیا اور آپ کو زادِ سفر اور ساز و سامان کی پیش کش کی۔

مگر آپ نے کسی بھی قسم کا سامان لینے سے انکار کر دیا۔ صرف یہ فرمایا: ہمارے بارے میں راز داری سے کام لینا۔[1]

سراقہ وہاں سے جانے لگا تو اچانک اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: (كَيْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَيْ كِسْرٰى وَ مَنْطِقَتَهُ وَ تَاجَهُ) ''سراقہ! تمھیں کیسا لگے گا، جب تم کسریٰ بن ہرمز کے دونوں کنگن، پیٹی اور اس کا تاج پہنو گے۔'' سراقہ نے یہ بات بڑے تعجب سے سنی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کہاں کسری بن ہرمز اور اس کے کنگن اور کہاں میں![2] ...... اس کے بعد قافلہ یثرب کی طرف بڑھ گیا۔ سراقہ واپس آیا تو دیکھا کہ لوگ قافلہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سراقہ کہنے لگا: ادھر کی کھوج خبر تو میں دُور دُور تک کر چکا ہوں۔ تمھیں اس طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمھارے حصے کا کام کر چکا ہوں۔ اور پھر جب اللہ کے رسول ﷺ بحفاظت مدینہ منورہ پہنچ گئے تو سراقہ نے لوگوں کو یہ واقعہ سُنایا۔ سراقہ نے امان نامہ سنبھال کر رکھا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ مکہ فتح ہوا۔ آپ ﷺ حنین اور طائف سے فتح یاب ہو کر جعرانہ کے مقام پر قیام فرما ہوئے۔

بنی مُدلج کا یہ سردار یہی امان نامہ لیے اللہ کے رسول ﷺ سے ملنے آیا۔ بدو آدمی تھا۔ تمام رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ انصار کے ایک گھوڑ سوار دستے نے اسے روکا کہ (إِلَيْكَ ، إِلَيْكَ مَاذَا تُرِيدُ) ''ارے!

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3906، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/102,103.

[2] أسد الغابة: 2/414.

کہاں منہ اُٹھائے جا رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟۔'' اس نے جواب میں وہی پروانہ جیب سے نکالا اور اسے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف بڑھایا۔ آپ ﷺ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے۔ عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ! (هَذَا كِتَابُكَ لِي وَأَنَا سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكٍ) ''یہ آپ ﷺ ہی کا دیا ہوا امان کا پروانہ ہے۔ میں سراقہ بن مالک ہوں۔''

ارشاد ہوا: (هَذَا يَوْمُ وَفَاءٍ وَبِرٌّ ، اُدْنُهْ) ''آج کا دن وفا نبھانے کا دن ہے۔ نیکی اور احسان کرنے کا دن ہے، میرے قریب آجاؤ۔'' [1]

پھر چند لمحات کے بعد سراقہ بن مالک کو صحابی بننے کا شرف نصیب ہوا۔ اب وہ اسلام کا ایک سچا سپاہی تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ آپ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے والے کسریٰ کی حکومت پاش پاش ہوئی اس کا غرور خاک میں مل گیا۔ اس کے خزانوں کو توڑا گیا۔ کسریٰ بن ہرمز کا تاج اس کی پیٹی اور کنگن مدینہ منورہ بھیجے گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حکم دیا: لوگو! سراقہ بن مالک کو بلاؤ، میرے نبی ﷺ کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ سراقہ آتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ پھر آپ نے ان کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے اور فرمایا: اللہ اکبر! اس اللہ کا شکر ہے جس نے ان کنگنوں کو کسریٰ بن ہرمز سے چھینا، وہ کسریٰ جو کہتا تھا (أنا رب الناس) ''میں لوگوں کا

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 2/103، 104، فتح الباری: 7/303.

رب ہوں۔'' آج اللہ نے مسلمانوں کو یہ عزت و وقار عطا فرمایا ہے کہ بنی مدلج کے ایک بدو کو اس کے کنگنوں کا مالک بنا دیا ہے۔[1]

اس طرح نبی کریم ﷺ نے خندق کی کھدائی کے موقع پر جو پیشین گوئی فرمائی تھی کہ مجھے کسریٰ کے خزانوں کی چابیاں عطا کر دی گئی ہیں وہ بھی فتح مدائن کے موقع پر پوری ہوگئی اور آپ کے خدام کو وہ چابیاں عطا کر دی گئیں۔

---

[1] أسد الغابة: 414/2.

40

یہود کا تعصب اور عداوت

یہود کو علم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ نبی انہی کی قوم میں سے ہوگا، اس لیے جب بشیر و نذیر تشریف لائے تو عربی النسل ہونے کی وجہ سے ان سے حسد کیا گیا۔ ان کا ایک عالم کہنے لگا: اے یہود کی جماعت! عنقریب بالکل انہی ایام میں آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ اور وہ ہماری ہی سرزمین پر تشریف لائیں گے۔ یہودی پوچھنے لگے: ان کی نشانیاں کیا ہیں؟۔ جواب ملا: میانہ قد کے ہوں گے، سفید رنگ کے سرخی مائل نہایت خوبصورت، حرہ کے پہاڑوں سے داخل ہوں گے۔ وہ اُمّی ہوں گے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہوں گے۔ ہجرت کے موقع پر یہ ساری نشانیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئیں۔ مگر ہائے رے حسد کہ اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔

ام المؤمنین سیدہ صفیہ بنتِ حُیی سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا: میں اپنے

والد اور چچا کی بڑی چہیتی تھی۔ وہ مجھ سے دوسری اولاد کے مقابلہ میں زیادہ پیار کرتے تھے۔ جب بھی دیکھتے فوراً گود میں اٹھا لیتے تھے۔ جب اللہ کے رسول قبا میں تشریف لائے تو میرے والد اور چچا بھی ملاقات کے لیے گئے۔ غروب آفتاب کے وقت واپس آئے تو بڑے تھکے ماندے، گرتے پڑتے لڑکھڑائی ہوئی چال چلتے نظر آئے۔ میں حسب معمول چہک کر ان کی طرف دوڑی مگر واللہ! انہیں اس قدر غم تھا کہ انھوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے چچا کو سنا وہ میرے والد حیی بن اخطب سے کہہ رہے تھے: کیا یہ وہی ہے؟۔ جواب ملا: ہاں اللہ کی قسم! چچا نے پوچھا: کیا آپ نے انہیں ٹھیک پہچانا ہے؟ والد نے کہاں ہاں۔ چچا نے کہا: تو پھر کیا ارادے ہیں؟ جواب ملا: عداوت، اللہ کی قسم! جب تک زندہ رہوں گا ان کی عداوت سے باز نہیں آؤں گا۔ [1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 132/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 533/2، والبداية والنهاية: 222,221/3.

41

یہودیوں کی کہہ مکرنیاں

عبداللہ بن سلام یہود کے ایک بڑے مشہور اور محترم عالم تھے۔ کہتے ہیں: میں نے نبی آخر الزماں ﷺ کی صفات تورات میں پڑھ رکھی تھیں۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو میں فوراً خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ چہرہ انور پہ نگاہ ڈالی تو گویا وہ چودھویں رات کا چمکتا ہوا چاند تھا۔ دل نے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کے قریب ہوا۔ آپ ارشاد فرما رہے تھے: (أَفْشُوا السَّلَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ) ''اے لوگو! سلام کو عام کرو، صلہ رحمی کرو، راتوں کو جب لوگ سو رہے ہوں نماز ادا کرو، نہایت سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔'' میں نے آپ ﷺ سے سوال کیا: آپ کون ہیں؟ فرمانے لگے: میں اللہ کا رسول ہوں۔

میں نے پوچھا: آپ کو کس نے مبعوث فرمایا ہے؟ ارشاد ہوا: اللہ نے۔ میں نے کہا: میں آپ سے قیامت کی نشانیاں پوچھنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا: جو جی چاہے، پوچھو۔ میں نے عرض کیا: تین سوال پوچھوں گا۔ پہلا سوال: قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ دوسرا: جنتی لوگ پہلا کھانا کیا تناول کریں گے؟ اور تیسرا: بچہ اپنی ماں یا باپ کے مشابہ کس بنا پر ہوتا ہے؟

ارشاد فرمایا: قیامت کی پہلی نشانی آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے دھکیلتی ہوئی مغرب کی طرف لے جائے گی۔ جنتی لوگوں کی پہلی ضیافت مچھلی کی کلیجی سے کی جائے گی۔ بچہ کے ماں یا باپ کے مشابہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مرد کا پانی سفید اور گاڑھا ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کا زرد اور پتلا۔ اگر ان میں سے ایک کا پانی دوسرے پر غالب آجائے تو بچہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا: آپ نے درست فرمایا۔ اور پھر گواہی دی (أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ) ایک دن میں نے کہا: یا رسول اللہ! یہود ایک بہتان باز قوم ہے۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا پتا چل گیا تو وہ مجھ پر بہتان تراشیں گے۔ آپ ﷺ نے یہود کو بلا بھیجا۔ عبداللہ بن سلام گھر کے اندر چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام کیسے آدمی ہیں؟ وہ بیک زبان کہنے لگے: وہ ہمارے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے بیٹے، سب سے اچھے اور سب سے اچھے کے بیٹے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے: ہمارے سردار اور ہمارے سردار کے بیٹے، افضل ترین شخص اور افضل ترین شخص کے بیٹے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اچھا اگر وہ

مسلمان ہو جائیں تو پھر؟ انھوں نے اوپر تلے دو تین بار کہا: اللہ انہیں اس سے محفوظ رکھے۔ اب عبداللہ بن سلام یہود کی یہ گفتگو سن کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے ان کے سامنے آ گئے۔

انہیں دیکھتے ہی یہود کہنے لگے: یہ ہمارا نہایت برا آدمی ہے اور سب سے برے آدمی کا بیٹا ہے۔ انہیں ان میں اور بھی طرح طرح کی برائیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کہ اے جماعت یہود! اللہ سے ڈرو۔ اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تم لوگ خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے سچے رسول ﷺ ہیں۔ حق لے کر تشریف لائے ہیں۔ مگر یہودیوں نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ ہم نہیں مانتے۔[1]

[1] البداية والنهاية: 3/219-221.

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ میدان بدر میں مسلمانوں کے جنگی کیمپ میں اللہ کے رسول کے جھنڈے تلے ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔ یہ جنگ بلاشبہ ''الفرقان'' تھی، یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی جنگ۔ جو اسلامی جھنڈے تلے کھڑا تھا، وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا تھا اور جو ابوجہل کے جھنڈے تلے تھا وہ اسلام کا، اللہ کا اور اس کے رسول کا دشمن تھا۔ ان کا والد ابوجہل کے کیمپ میں تھا۔ لڑائی شروع ہوئی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شیر کی طرح لپکے اور اپنے والد کو واصل جہنم کر دیا۔[1] قارئین کرام! ذرا غور فرمائیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور شیفتگی کا کتنا سچا اور کھرا نمونہ پیش فرما دیا کہ

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی: 154/1، المستدرک للحاکم: 265/3، مستدرک کے محقق عبدالسلام بن محمد علّوش کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ کے اپنے باپ کو قتل کرنے والی روایت مرسل صحیح ہے۔

خون کے رشتے کو ذرا بھی اہمیت نہ دی اور اپنے اسلام دشمن باپ کو پکے دشمن کی طرح موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے کھرے پن کا حقیقی معیار یہی ہے کہ اللہ رب العزت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت وفدویت کے مقابلے میں زندگی کے عزیز ترین رشتے بھی بلا تأمل قربان کر دیے جائیں۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پرورش آپ ﷺ کے سایۂ عاطفت میں آپ ﷺ ہی کے گھر میں ہوئی۔ انھوں نے آپ ﷺ کی صفات کو دیکھا آپ کی سیرت کو قریب سے دیکھا اور آپ ﷺ کے ایسے شیدا ہوئے اور آپ ﷺ سے اس طرح محبت کی جس طرح ایک بیٹا اپنے باپ سے محبت کرتا ہے۔ اسی محبت کا مظاہرہ تھا کہ ہجرت کی پرخطر رات مشرکین آپ ﷺ کے دروازے پر تلواریں سونتے کھڑے تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ذرا بھی ہراس طاری نہیں ہوا۔ وہ دشمنوں کی چمکتی ہوئی شمشیروں کے سائے میں بے دریغ اللہ کے رسول ﷺ کی سبز چادر اوڑھ کر آپ ﷺ کے بستر پر سوئے رہے۔[1]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ننھے سے انس کو اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے خادم خاص تھے۔ آپ ﷺ کے چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے 93 ہجری میں رحلت فرما گئے۔ ان کا تعلق قبیلۂ خزرج سے تھا۔ کنیت ابو حمزہ تھی، کثیر الاولاد تھے۔ مؤرخین کے مطابق ان کے بیٹے بیٹیوں اور پوتوں نواسوں کی تعداد ایک 100 سو سے زیادہ تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے 78

---

[1] السيرة النبوية لابن ہشام: 2/96.

بیٹے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ نامور بصری محدث ابوعمیر عبدالکریم بن محمد انہی کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے اخلاق حمیدہ کی صفت یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی دس سال تک خدمت کی۔ اس دوران آپ ﷺ کی شفقت کا یہ عالم رہا کہ مجھے کبھی اف تک نہیں کہا۔ مارا نہ ڈانٹا، نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے فلاں کام کیوں نہیں کیا اور یہ کام کیوں کیا۔ پوری تاریخ انسانیت میں بھلا ایسا آقا کون ہوگا جو اتنے بالیدہ اخلاق کی منفرد کسوٹی پر پورا اترنے کی ہمت کر سکے گا؟ تاریخ عالم میں کہیں کسی ایک شخص کی بھی مثال ایسی نہیں جس کا اخلاق اپنے خادم کے ساتھ اتنا نادر اور یگانہ ہو۔ اور یہ ایک دو دن کی بات نہیں، پورے دس سال کی سرگزشت ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپ کے سراپائے اقدس کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بھی سننے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ دنیا میں ریشم اور حریر کی مثال دی جاتی ہے کہ وہ بڑی نرم اور نازک ہوتی ہے۔ انس بن مالک بتلاتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کے دست مبارک کو ریشم اور حریر سے بھی زیادہ نرم و نازک پایا۔ میں نے کوئی خوشبو اللہ کے رسول کے جسم اطہر سے پھوٹنے والی مہک سے بہتر نہیں پائی۔[1]

اللہ کے رسول ﷺ کی شفقت و رحمت کا ایک اور نمونہ دیکھیے، زید بن حارثہ آپ ﷺ کے غلام تھے لیکن آپ ﷺ نے اُن سے اتنا کریمانہ برتاؤ کیا کہ وہ آپ سے اپنے ماں باپ سے بڑھ کر محبت کرنے لگے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ حارثہ بن

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3561، وصحیح مسلم، حدیث: 81,82.

شراحیل کے صاحبزادے تھے۔ قبیلہ کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ ایک موقع پر اپنے میکے گئیں، صاحبزادے کو بھی ساتھ لے گئیں۔ اس وقت زید صرف 8 سال کے تھے۔ اس موقع پر بنی قیس بن جسرہ کے لوگوں نے ان کی والدہ کے خاندان والوں اور نواحی لوگوں پر حملہ کیا۔ لوٹ مار کے دوران انھوں نے جن لوگوں کو پکڑا ان میں یہ زید بھی شامل تھے۔ یہ ظالم لوگ طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں پہنچے جہاں انھوں نے زید کو بیچ ڈالا۔ ان کے خریدار حکیم بن حزام تھے۔ وہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ انھوں نے زید کو حضرت خدیجہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا تو انھوں نے زید بن حارثہ کو اپنے شوہر والا گہر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر مامور کر دیا۔ وہ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت خدیجہ اور حضرت علی جیسی ان اولین ہستیوں میں سے تھے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر سب سے پہلے بلا تأمل ایمان لے آئی تھیں۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس غلام کو غلامی سے چھڑانے کے لیے اس کے والد حارثہ اپنے بھائی کے ساتھ مکہ آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ ہم اپنے بیٹے کو چھڑوانے آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنا معاوضہ طلب فرمائیں، ہم دینے کو تیار ہیں۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ زید میری طرف سے آزاد ہے۔ بس اس سے پوچھ لو اگر یہ جانا چاہتا ہے تو لے جاؤ، مجھے

کوئی اعتراض نہیں۔ اختیار تمھارے بیٹے کا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ انصاف کی بات کیا ہوسکتی تھی؟...... اور پھر باپ اور چچا فوراً زید کے پاس گئے اور کہنے لگے: چلو تمھیں آزادی کا پروانہ مل چکا ہے، ہم تمھیں لینے آئے ہیں...... ادھر زید کا عالم ہی نرالا تھا۔ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو قریب سے دیکھا تھا۔ اور آپ ﷺ کے عدیم النظیر اخلاق اور شفقت و مرحمت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ انھوں نے بلا تأمل کہا کہ میں محمد (ﷺ) پر کسی کو بھی ترجیح نہیں دوں گا۔ محمد ﷺ کی غلامی پر ہزاروں آزادیاں قربان ہیں۔

یہ جواب سن کر باپ اور چچا ناراض ہو گئے، کہنے لگے: زید! تمھارا ناس ہو، تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دے رہے ہو۔ اپنے والد اور چچا اور اپنے خاندان پر محمد ﷺ کو ترجیح دے رہے ہو۔ حضرت زید کہتے ہیں ہاں غلامی تو ہے مگر تم لوگ جانتے نہیں کہ یہ کس کی غلامی ہے؟ بلاشبہ میں نے محمد ﷺ میں جو محبت، الفت، پیار اور جملہ مکارم اخلاق دیکھے ہیں، اس کے بعد میں ان ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

رحمت عالم ﷺ زید کے اس فیصلہ سے اس قدر مطمئن اور مسرور ہوئے کہ زید کا ہاتھ پکڑا، کعبہ میں پہنچے، لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: آج سے زید میرا غلام نہیں میرا بیٹا ہے۔ لوگوں نے زید کو رشک اور حیرت سے دیکھا اور پھر مکہ کے گلی کوچوں میں ان کا نام زید بن محمد پکارا جانے لگا[1]۔

---

[1] أسد الغابة في معرفة الصحابة: 352,351/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 42,41/3.

مکہ کے ایک نوجوان نے نورِ اسلام سے منور ہونے کے بعد ہجرت کی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہُوا۔ اس کے سرپرست چچا نے اس سے ضرورت کی ہر چیز چھین لی۔ اس دور کے معاشرے کے لحاظ سے وہ ایک بہت ہی بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے خاندان والوں کی نظر میں اس سے بڑا کوئی پاپ نہیں تھا۔ اس سے تن کے کپڑے تک چھین لیے گئے۔ اُسے ایک ٹاٹ میسر آیا۔ اس نے ٹاٹ کے دو ٹکڑے کر لیے۔ ایک سے ستر چھپایا اور دوسرے سے اپنے جسم کے باقی حصے کو چھپانے کی کوشش کی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے اس حال میں دیکھا تو مشفق اور رحیم و کریم نبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دریافت فرمایا: تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کیا: عبدالعُزّیٰ، فرمایا: آج سے تم

عبداللہ ہو۔ چونکہ اس نے ٹاٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اسے ذوالبجادین (ٹاٹ کے دو ٹکڑوں والا) کا خطاب دیا۔ اب ان کا نام عبداللہ ہوگیااور یہ اصحابِ صفہ میں شامل ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے ان ساتھیوں سے بے حد محبت فرماتے تھے، ان کے پاس بیٹھتے تھے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ان کی مشکلات اور پریشانیوں کے حل میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آپ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے۔ دس ہزار سے زیادہ مجاہدین آپ کی معیت میں تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ان مجاہدین میں شامل تھے۔

رات کا وقت تھا۔ سارا لشکر سو رہا تھا۔ عبداللہ بن مسعود اٹھے۔ لشکر کے آخری کنارے پر روشنی نظر آئی۔ اللہ کے رسول کے بستر پر نظر ڈالی، بستر خالی تھا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بستر پر نظر دوڑائی وہ بھی موجود نہیں تھے۔ اب ان کا رخ روشنی کی طرف ہو گیا۔ دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ قبر میں کھڑے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی میت ہاتھوں میں تھام رکھی ہے جسے وہ اللہ کے رسول ﷺ کو پکڑا رہے ہیں۔ اللہ کے رسول! یہ کون خوش قسمت ہے جو آپ کے مبارک ہاتھوں سے لحد میں اتارا جا رہا ہے؟۔

ارشاد ہوا: یہ تمھارا بھائی عبداللہ ذوالبجادین ہے جو شام کو وفات پا گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے عبداللہ کے گالوں کے نیچے اپنے مقدس اور مبارک ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں آپ کے آنسو عبداللہ کے رخساروں پر یوں

ٹپک رہے تھے جیسے موتیوں کی لڑیاں گرتی ہیں۔ عبداللہ کو قبر میں اتارا، قبلہ رخ کیا اور بارگاہ الٰہی میں ہاتھ پھیلا دیے۔ اللہ رب العزت سے عرض کیا:

(اَللّٰهُمَّ أَمْسَيْتُ عَنْهُ رَاضِيًا فَارْضَ عَنْهُ) ''اے اللہ! آج شام تک، یعنی اس کی وفات تک میں اس سے راضی تھا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔'' یہ الفاظ آپ ﷺ بار بار دہرا رہے تھے۔ واہ رے مقدر کے سکندر! امام انسانیت لحد میں اتار رہے ہیں۔ ابوبکر و عمر قبر پر کھڑے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ اس کے لیے بار بار دعائے مغفرت فرما رہے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ بے اختیار بولے: (يَا لَيْتَنِي كُنْتُ صَاحِبَ هٰذَا الْقَبْرِ) ''کاش اس قبر میں دفن ہونے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی۔''[1]

نبی کریم ﷺ پوری زندگی میں صرف پانچ مرتبہ قبر میں اترے ہیں ان میں سے ایک موقع عبداللہ ذوالبجادین کو نصیب ہوا۔ ایک دن حرم مکی میں اللہ کے رسول تشریف فرما تھے۔ اردگرد حضرت بلال، صہیب رومی، عمار بن یاسر اور ابن مسعود بیٹھے تھے۔ دین کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران ابوجہل آ گیا اس نے دیکھا کہ سارے فقراء و مساکین آپ کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ وہ دولت کے خمار اور خاندانی فخر و تکبر کے نشہ میں چور ہو کر کہنے لگا: اے محمد! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم بڑے لوگ، یعنی مکہ کے روساء آپ کے پاس بیٹھیں، آپ کی باتیں سنیں تو

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 182.181/4، والبدایۃ والنہایۃ: 21/5، وصفۃ الصفوۃ: 679-677/1.

پھر ان فقیروں اور بے نواؤں کو اٹھا دیں۔ امت کے خیر خواہ نے سوچا: اس میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں، کچھ دیر غور فرمایا اور طبیعت مائل ہوئی کہ ابوجہل کی بات مان لی جائے اور اپنے مسکین ساتھیوں کو تھوڑی دیر کے لیے اٹھا دوں شاید بڑے سردار راہ راست پر آ جائیں۔ ادھر یہ تصور کیا اُدھر اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر یہ حکم سنایا:

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، انہیں اپنے سے دور نہ کیجیے۔ ان کے حساب سے آپ کے ذمہ کچھ نہیں اور نہ آپ کے حساب سے کچھ ان کے ذمہ ہے، لہٰذا اگر آپ انہیں دور ہٹائیں گے تو بے انصافوں میں شمار ہوں گے۔''[1]

چنانچہ رسول رحمت ﷺ نے فقراء و مساکین کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ ان کی ہر موقع پر حوصلہ افزائی کی اور انہیں معاشرے میں باعزت مقام عطا فرمایا۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سے ایک صحت مند خوشحال شخص گزرا۔ آپ ﷺ نے پاس بیٹھے صحابۂ کرام سے پوچھا:

---

[1] الأنعام 52:6، وتفسیر ابن کثیر: 183/2.

ساتھیو! اس شخص کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ لوگوں میں نہایت نمایاں اور معروف آدمی ہے، اشراف میں سے ہے۔ اگر کسی گھرانے کو پیغام نکاح بھجوائے تو قبول کیا جائے گا۔ اگر کسی کی سفارش کرے تو مان لی جائے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور شخص کا گزر ہوا۔ پوچھا: ساتھیو! اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ کہنے لگے: یہ مسلمانوں میں سے ہے۔ فقیر ہے۔ بالکل معمولی سا آدمی ہے۔ اگر کسی گھرانے میں پیغامِ نکاح بھجوائے تو کوئی اسے قبول نہ کرے گا۔ نہ اس کی کوئی سفارش مانی جائے گی۔ اگر مجلس میں بات کہے تو کوئی اسے سننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

قارئین کرام! اب ذرا نبی کریم ﷺ کے الفاظ پر غور فرمائیں۔ اس رسول رحمت وشفقت ﷺ نے نیک اور صالح غریبوں، ناداروں کس مپرسوں اور بے نواؤں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: (هَذَا خَيْرٌ مِّنْ مِّلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هَذَا) ''اس خوشحال آدمی جیسوں سے ساری زمین بھری ہوئی ہو تو یہ غریب اور مسکین آدمی ان سب سے بہتر ہے۔''[1]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 6447،5091.

44

کھجور کا تنا رونے لگا

مسجد نبوی کی چھت کھجور کے تنوں پر بنائی گئی تھی، یعنی کھجور کے تنوں سے ستونوں کا کام لیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کھجور کے ایک تنے کے سہارے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی خطبہ لمبا ہو جاتا تھا، اس لیے ایک انصاری عورت نے آپ ﷺ کی سہولت کے لیے گذارش کی: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم آپ ﷺ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز سے اتفاق فرمایا تو آپ کے لیے جھاؤ کے درخت سے تین سیڑھیوں والا ایک منبر تیار کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کا دن آیا تو آپ تنے کی بجائے منبر کی طرف تشریف لے گئے۔ وہ تنا، غمِ فراق سے رونے لگا۔

صحیح بخاری میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن (خطبہ کے وقت) ایک درخت یا کھجور کے تنے کے پاس کھڑے ہوتے

تھے۔ ایک انصاری نے پیش کش کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جیسے تمہاری مرضی۔''

تو انصاری نے آپ کے لیے ایک منبر بنوا دیا۔ جمعہ کا دن ہوا۔ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو وہ تنا بچے کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔ نبی کریم ﷺ منبر سے اترے اور اس تنے کو آغوش میں لے لیا تو وہ اس بچے کی طرح ہچکیاں لینے لگا جسے بہلا کر چپ کرایا جا رہا ہو۔ تنے کا رونا، فراق رسول ﷺ اور ذکر اللہ سے محرومی کی بنا پر تھا جسے وہ پہلے قریب سے سنا کرتا تھا۔ [1]

غرض تنے کے رونے کا واقعہ بہت مشہور ہے اور اس کی احادیث متواتر ہیں۔ صحیح روایت کی پابندی کرنے والے تمام محدثین کرام نے اسے اپنی صحاح میں بیان کیا ہے۔ مزید برآں یہ واقعہ دس سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا ہے۔

منبر 8 ہجری میں بنایا گیا، اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ نبی کریم ﷺ تیسری سیڑھی پر تشریف فرما ہوتے تھے اور اپنے پاؤں مبارک دوسری سیڑھی پر رکھتے تھے۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ از راہ ادب دوسری سیڑھی پر بیٹھتے تھے اور پاؤں پہلی سیڑھی پر رکھتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو تقریر کے وقت پہلی سیڑھی پر کھڑے ہوتے تھے اور بیٹھتے وقت پاؤں زمین پر رکھ لیتے تھے۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو چھ سال تک تو وہ اسی طریقے پر عمل پیرا رہے، بعد ازاں وہ

[1] صحیح البخاري، الحدیث: 2095.

نبی کریم ﷺ ہی کی جگہ پر بیٹھنے لگے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے آئے تو انہوں نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا۔ لیکن اصل منبر نبوی کو اضافی سیڑھیوں کے اوپر ہی رکھا گیا اس طرح بیٹھنے کی جگہ سمیت منبر کی نو سیڑھیاں بن گئیں۔

منبر کے بارے میں آپ کے فرمودات اس کے بلند مرتبہ کو واضح کرتے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرے گھر اور منبر کا درمیانی ٹکڑا جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر میرے حوض (کوثر) پر ہوگا۔''

''جنت کا باغیچہ ہونے'' سے مراد یہ ہے کہ نزول رحمت اور حصول سعادت کے لحاظ سے وہ ٹھیک جنت کے باغیچے کی طرح ہے کیونکہ وہاں ہر وقت اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جگہ پر کی گئی عبادت جنت تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سے ظاہری مطلب بھی مراد ہو سکتا ہے کہ یہ حصہ حقیقتاً جنت ہی کا حصہ ہو گا، یعنی قیامت کے بعد یہ حصہ جنت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ علماء نے یہ سب مطالب بیان کیے ہیں۔[1]

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: 1888، و فتح الباری: 4/130.

45

وہ جو آپ کے صبر و تحمل کا امتحان لینے آیا

زید بن سعنہ ایک یہودی عالم تھا۔ اس نے تورات شریف میں آپ کی صفات پڑھ رکھی تھیں۔ حق کا متلاشی تھا۔ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی تمام علامات اس پر واضح ہو چکی تھیں۔ صرف دو صفتیں ایسی تھیں جن کی وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ ایک یہ کہ (یَسْبِقُ حِلْمُهٗ جَهْلَهٗ) ''آپ ﷺ کا تحمل آپ ﷺ کے غصہ پر غالب ہوگا۔'' دوسری صفت (وَلَا یَزِیدُهٗ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَیْهِ إِلَّا حِلْمًا) ''ان سے شدید جہالت کے سلوک کے باوجود ان کے حلم میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔''

یہ دونوں صفات مکارم اخلاق کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ بھلا ایسا کون ہے جس سے بدتمیزی کی جائے اور وہ اس کے جواب میں اچھا سلوک کرے۔ زید بن سعنہ مختلف بہانوں سے آپ کی مجالس میں آتا تھا، ملاقات کرتا تھا اور مذکورہ صفات کو آپ کی ذات گرامی میں دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ تھوڑے ہی

دن گزرے تھے کہ اسے یہ موقع میسر آ گیا۔ زید کے اپنے الفاظ یہ ہیں: میں آپ کی مجلس میں تھا۔ ایک اعرابی آیا۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے علاقے کے کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اب انہیں قحط اور فقر و فاقہ کا سامنا ہے۔ اگر انہیں فوری مدد نہ ملی تو خطرہ ہے کہیں وہ اسلام سے نکل نہ جائیں۔ آپ سے امداد کا طالب ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس رقم نہیں تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پلان بنایا اور اللہ کے رسول ﷺ سے کہا: میں آپ کے لیے فلاں آدمی کے باغ سے ایک وسق کھجور خرید لیتا ہوں (وسق تقریبا 200 کلوگرام کا ہوتا ہے) اور آپ کو دے دیتا ہوں آپ کھجوریں کچھ دن کے بعد دے دیجیے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: کسی خاص شخص سے خریدنے کی بات نہ کرو بلکہ تم مجھ سے یہ کھجوریں ایک خاص مدت کے بعد وصول کر لینا اور ادائیگی ابھی کر دو۔ میں نے اپنی پوٹلی کھولی اس میں سے 80 دینار نکالے اور آپ ﷺ کے حوالے کر دیے۔ آپ ﷺ نے اسی وقت اعرابی کو بلایا اور اسے رقم دے کر فرمایا: اپنے علاقے میں فوراً واپس چلے جاؤ اور لوگوں کی مدد کرو۔

ابھی کھجوروں کی ادائیگی کے وعدے کی میعاد میں دو تین دن باقی تھے کہ میں نے ان کے تحمل و بردباری کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا۔ ایک جنازے کی ادائیگی کے لیے آپ حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ جنازہ سے فارغ ہوئے تو میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق اچانک آپ کی چادر پکڑ لی اور اتنے زور سے کھینچی کہ وہ آپ کے کندھے سے اتر گئی اور ساتھ ہی نہایت کرخت لہجہ میں کہا: محمد (ﷺ)!

میرا قرض واپس نہیں کرو گے؟ تم بنو عبدالمطلب کے لوگ قرض واپس کرنے میں اچھے نہیں ہو۔ ادائے قرض میں بہت دیر کرتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ لوگوں سے تمھارے معاملات کی کیا حالت ہے!

زید کا یہ مطالبہ نہایت غیر معقول تھا۔ کیونکہ ابھی وعدے کی مدت میں کئی دن باقی تھے اور پھر انداز ایسا بازاری جس میں پورے خاندان کو گھسیٹا گیا ہو، کسی بھی شخص کو غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور اس کی بکواس سن رہے تھے۔ وہ بھلا کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ فوراً بولے: او اللہ کے دشمن! تمھاری یہ جرأت کہ تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی گھٹیا گفتگو کر رہے ہو۔ یہ میں کیا دیکھ سن رہا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر مجھے ان کی پاسداری نہ ہوتی تو تمھاری اس بدتمیزی پر تمھاری گردن اُڑا دیتا۔ تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم ایسی واہیات گفتگو کرو۔ اب ذرا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ردِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ اتنی سخت گفتگو سننے کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ موجود رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کیا اور فرمایا: عمر! ایسی بات نہ کرو بلکہ (أَنْ تَأْمُرَنِي بِحُسْنِ الْأَدَاءِ و تَأْمُرَهُ بِحُسْنِ اتِّبَاعِهِ) ''تمھیں چاہیے تھا کہ تم مجھ سے یہ کہتے کہ میں اس کا قرض خوش اسلوبی سے ادا کروں اور اسے یہ سمجھاتے کہ میاں! قرض کا تقاضا بھلے طریقے سے کرو۔''

پھر حکم دیا: عمر جاؤ اور اس کا قرض واپس کرو اور ہاں چونکہ تم نے اسے ڈرایا، دھمکایا ہے، اس لیے اسے بیس صاع (قریباً 50 کلو) کھجوریں زیادہ ادا کرو۔

زید بن سعنہ نہایت توجہ سے یہ گفتگو سن رہا تھا اور حیران تھا کہ اس قدر اشتعال انگیز گفتگو کے باوجود بھی آپ ﷺ حسب سابق تبسم کناں ہیں، بلاشبہ آپ کا حلم آپ کے غصہ پر سبقت لے گیا ہے۔ زید کہتے ہیں:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھے ساتھ لے کر بیت المال گئے۔ میرا قرض واپس کیا اور حسب ہدایت بیس صاع کھجوریں زیادہ بھی دیں۔ میں نے کہا: عمر کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں تم ہی بتاؤ۔ تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں زید بن سعنہ ہوں۔ کہنے لگے: اچھا الحبر، یعنی وہی جو مشہور یہودی عالم ہے۔ میں نے کہا کہ جی ہاں الحبر۔ اب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ جو تم نے اللہ کے رسول ﷺ سے گفتگو کی ہے اور ان کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آئے ہو تمھیں اس کا ہرگز کوئی حق نہیں تھا۔

میں نے کہا: عمر! تم ٹھیک کہتے ہو مگر تمھیں معلوم نہیں کہ میں حق کا متلاشی تھا۔ میں نے نبوت کی تمام صفات آپ میں دیکھ لی تھیں۔ دو صفتیں باقی رہ گئی تھیں۔ جن کا تعلق آپ کے تحمل، حوصلہ مندی اور بردباری سے تھا۔ آج میں نے ان صفات کا بھی خوب مشاہدہ کرلیا ہے۔ بلاشبہ وہ نبی آخر الزماں ہیں۔ عمر! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں آج سے سچے دل سے اسلام قبول کرتا ہوں، پھر کلمہ طیبہ پڑھا اور صحابیت کے شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ ان کے اسلام لانے کا یہ واقعہ طبرانی، ابن حبان، حاکم، بیہقی، ابونعیم اور ابو الشیخ نے اخلاق النبی ﷺ کے باب میں بیان کیا ہے۔[1]

---

[1] دلائل النبوۃ للبیھقي: 6/278-280، والأحادیث الطوال للطبراني، ص: 24-26.

الشفاء میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ آپ کے جسم اطہر پر گاڑھے حاشیے والی چادر تھی۔ ایک بدو آیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اتنے زور سے کھینچی کہ آپ کے مبارک کندھے پر نشان پڑ گئے، پھر وہ نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے ان دو اونٹوں پر اللہ کا مال لدواؤ۔ اور ہاں سن لو، یہ مال نہ تمھارا ہے نہ تمھارے باپ کا ہے۔ آپ بدو کی اس بے ہودہ گفتگو پر خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا: سنو! مال تو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ میں اس کا بندہ ہوں لیکن تم نے مجھ سے جو بدتمیزی کی ہے اس کا بدلہ تو لیا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بات تو درست ہے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا کریں گے نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: آخر کیوں؟ وہ بولا: (لِأَنَّكَ لَا تُكَافِئُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ) "اس لیے کہ آپ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے۔" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب سُن کر مسکرا دیے، پھر حکم دیا کہ بدو کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔[1] قارئین کرام! یہ ہے ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق کی ایک جھلک۔ کیا دنیا میں ان جیسا کوئی اور ہے؟

ع...... کوئی کہاں سے تمھارا جواب لائے گا؟

---

[1] الشفا 140/1.